احیائے اسلام و امنِ عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

جون 2024ء

حج: وحدتِ امت کا ذریعہ

قربانی کا فلسفہ و حکمت

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا علمی و فکری خصوصی خطاب

حق کے انکار اور کسی کی فضیلت و برتری تسلیم نہ کرنے کا سبب باہمی حسد و بغض ہے

احوالِ قلب اور نفس و روح کے مابین جنگ

تصورِ فنا و بقا اور انسانی زندگی

راہِ محبت و شوق میں تعلق باللہ کے مختلف راستے

شازیہ مرتضیٰ شہید

تنزیلہ امجد شہید

محمد عمر صدیق شہید

محمد اقبال شہید

غلام رسول شہید

حکیم صفدر حسین شہید

محمد عاصم حسین شہید

خاور نوید رانجھا شہید

سانحہ ماڈل ٹاؤن کے 10 برس

متاثرین انصاف سے محروم

رضوان خان شہید

شہباز مصطفوی شہید

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا

فروغِ امن اور انسدادِ دہشت گردی کیلئے اِسلامی نصاب

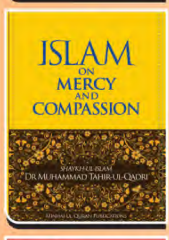

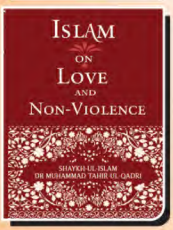

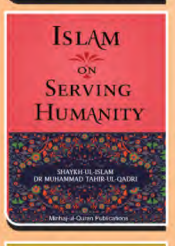

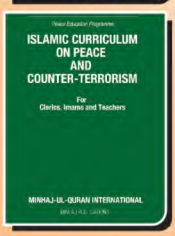

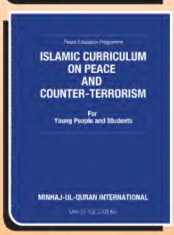

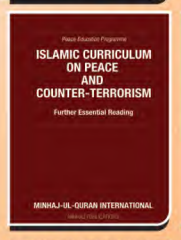

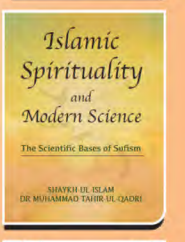

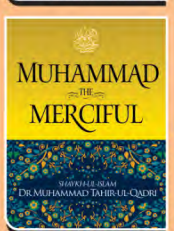

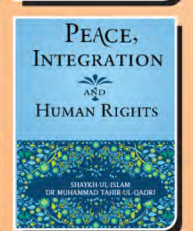

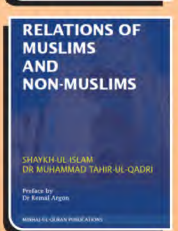

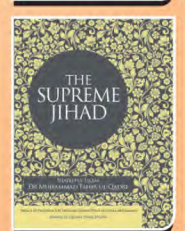

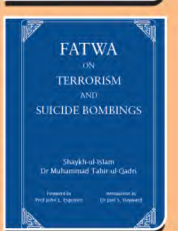

احیائے اسلام اور امن عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

بفیضان نظر
قدوۃ الاولیاء شیخ المشائخ حضرت سیدنا طاہر علاؤالدین القادری الگیلانی البغدادی قدس سرہ العزیز

زیر سرپرستی
شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر حسن محی الدین قادری | ڈاکٹر حسین محی الدین قادری

جلد: 38 / شمارہ: 6 | ذوالحج ۱۴۴۵ھ / جون 2024ء

چیف ایڈیٹر: نور اللہ صدیقی
ایڈیٹر: محمد یوسف
ڈپٹی ایڈیٹر: محبوب حسین

ایڈیٹوریل بورڈ
محمد رفیق نجم، محمد فاروق رانا
عین الحق بغدادی

مجلس مشاورت
خرم نواز گنڈاپور، احمد نواز انجم، جی ایم ملک
محمد جواد حامد، سرفراز احمد خان، منظور حسین قادری
غلام مرتضیٰ علوی، سید علی عباس بخاری، فیصل حسین مشہدی
محمد بلال اُپل، علی عمران، داؤد حسین مشہدی

قلمی معاونین
مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی، محمد شفقت اللہ قادری
ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، پروفیسر محمد الیاس اعظمی
ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی، ڈاکٹر محمد افضل قادری

حسن ترتیب — خصوصی اشاعت

اداریہ: عدل وانصاف کی ناگزیریت اور قرآنی احکامات	چیف ایڈیٹر	3
القرآن: حسد وعناد حق کے انکار کا سبب بنتا ہے	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری	6
فقہی مسائل: حج: وحدتِ امت کا ذریعہ	مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی	16
احوالِ قلب اور نفس وروح کے مابین جنگ	ڈاکٹر حسن محی الدین قادری	21
تصورِ فنا وبقا اور حیاتِ انسانی	ڈاکٹر حسین محی الدین قادری	33
راہِ محبت وشوق میں تعلق باللہ کے مختلف راستے	شیخ حماد مصطفیٰ المدنی القادری	41
قربانی کا فلسفہ وحکمت اور احکام ومسائل	ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی	50
اسلام اور اقامتِ عدل وانصاف	ڈاکٹر حافظ محمد سعد اللہ	64
سانحۂ ماڈل ٹاؤن کے 10 برس: متاثرین انصاف سے محروم	نعیم الدین چودھری	70
عرس مبارک: حضرت ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ	رپورٹ: سعید اختر منہاجین	77
انتقالِ پُر ملال: علامہ غلام ربانی تیمورؒ		79

کمپیوٹر آپریٹر: محمد اشفاق انجم | گرافکس: عبدالسلام
خطاطی: محمد اکرم قادری | حکاکی: قاضی محمود الاسلام

قیمت فی شمارہ: 60 روپے | سالانہ خریداری: 700 روپے

ملک بھر کے تعلیمی اداروں اور لائبریریوں کیلئے منظور شدہ
www.minhaj.info
www.facebook.com/minhajulquran
email:mqmujallah@gmail.com (مجلّہ آفس وسالانہ خریداران)
minhaj.membership@gmail.com (نظامت ممبرشپ/رفقاء)
smdfa@minhaj.org (بیرون ملک رفقاء)

انتباہ!
مجلّہ منہاج القرآن میں آنے والے جملہ پرائیویٹ اشتہار خلوص نیت سے شائع کئے جاتے ہیں
ادارہ کی کسی کاروبار میں شراکت ہے اور نہ ہی ادارہ فریقین کے درمیان کسی بھی قسم کے لین دین کا ذمہ دار ہوگا۔

بدل اشتراک: مشرق وسطی جنوب مشرقی ایشیاء، یورپ، افریقہ، آسٹریلیا، کینیڈا، مشرق بعید جنوبی امریکہ وریاستہائے متحدہ امریکہ 30 امریکی ڈالر سالانہ

ترسیل زر کا پتہ: اکاؤنٹ نمبر 02930103644000 میزان بینک شالیمار لنک روڈ لاہور پاکستان

ناشر: محمد اشرف قادری، مطبع: منہاج القرآن پرنٹرز 365 ایم ماڈل ٹاؤن لاہور UAN:042-111-140-140 Ext: 128

حمدِ باری تعالیٰ

خدا ہی کو زیبا ہیں سب خوبیاں
جو ہے پاک پروردگارِ جہاں

قیامت کے دن کا ہے مالک وہی
جو دے گا جزا سب کو اعمال کی

فقط ہم تجھے پوجتے ہیں خدا
تجھی سے مدد مانگتے ہیں سدا

دکھا ہم کو یا رب رہِ مستقیم
ہمیں راہِ حق پر چلا اے کریم

تو ان پاک لوگوں کا رستہ دکھا
کہ جن پر سدا فضل تیرا ہوا

نہ ان کا ہوا جن پہ نازل غضب
نہ گمراہوں کی رہ دکھا میرے رب

ہماری دعا کر قبول اے خدا
ترے بن نہیں کوئی سنتا دعا

﴿حدیدؔ مرزا﴾

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

دَرِ حضورؐ سے مل جائے مغفرت کی نوید
مِری حیات کا ہو جائے لمحہ لمحہ سعید

اے کاش! رحمتِ عالمؐ زراہِ لطف وکرم
عطا سے بھردیں مرا بھی یہ کاسۂ امید

شبِ سیاہِ زمانہ طویل تر ٹھہری
ہے تیرگی میں طلب روشنی کی مجھ کو مزید

ہوائے نفس کا جس میں نہیں ہے شائبہ تک
وہ قولِ سرورؐ کون و مکاں ہے قولِ سدید

یہی عقیدہ ہے ایماں کے باب میں اپنا
اساسِ دینِ متیں مصطفیٰ سے حبِ شدید

حضورؐ دامنِ رحمت میں اپنے لے لیں گے
شفیعؐ عرصۂ محشر سے کچھ نہیں ہے بعید

ہوں اس لیے مَیں قیامت کا منتظر نیّرؔ
کہ ہوگی اُس میں سرِ عام مجھ کو آپؐ کی دید

﴿ضیاء نیّرؔ﴾

اداریہ

عدل و انصاف کی ناگزیریت اور قرآنی احکامات

انصاف کے بغیر کوئی معاشرہ اپنا اخلاقی وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک معروف قول ہے کہ کفر کا نظام تو چل سکتا ہے مگر ظلم کا نہیں۔ تاریخِ انسانی میں بڑے بڑے ظالم آئے جنہیں اپنے خدا ہونے کا زعم تھا اور پھر وہ نشانِ عبرت بنا دیئے گئے۔ انصاف انسانی معاشروں کا جوہرِ حیات ہے، انصاف کے بغیر امن، استحکام، خوشحالی، اعتدال و رواداری کی اعلیٰ انسانی اقدار کو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ نظامِ عدل طاقتور اور کمزور، زبردست اور زیردست، قاتل اور مقتول، امیر اور غریب کے مابین قانون کے مطابق انصاف کرتا ہے اور طاقتور کو ظلم کرنے پر سزا اور کمزور کو ظلم سے بچاتا ہے۔ جب ظالم اور مظلوم کے درمیان سے قانون اور نظامِ عدل کی دیوار ہٹ جاتی ہے تو معاشرے جنگل کی طرح ہو جاتے ہیں جہاں طاقتور اپنی بھوک مٹانے کیلئے کمزور کو جب چاہے، جہاں چاہے اور جس وقت چاہے نگل جاتا ہے۔ جنگل اور انسانی معاشروں کے مابین فرق صرف قانون کی حکمرانی اور نظامِ عدل کا ہے۔

قرآن مجید قیامت تک کے لیے ایک زندہ و جاوید کتابِ ہدایت ہے۔ اس الوہی کتاب میں انسانوں کو زندگی گزارنے کا سلیقہ اور طریقہ عطا کیا گیا ہے اور ایسی ہدایات دی گئی ہیں کہ جنہیں نظر انداز کرنے سے تباہی اور بربادی جنم لیتی ہے۔ اللہ رب العزت نے اس کتابِ ہدایت کے ذریعے کچھ ایسے اصول عطا کیے ہیں جن پر عمل درآمد کرنے میں انسانیت کا بھلا اور خیر ہے۔ جو افراد اور معاشرے ان اصولوں کو نظر انداز کریں گے، ان کی زندگیاں بے سکون ہو کر رہ جائیں گی۔ ان اصولوں میں سے ایک بڑا اصول ہر حال میں انصاف کرنے اور گواہی دینے کا ہے۔ کتابِ ہدایت میں جہاں نظامِ عدل کی شفافیت پر زور دیا گیا ہے، وہاں اربابِ عدلیہ کے لیے بھی کچھ احکامات صادر کیے گئے ہیں۔ کتابِ ہدایت میں منصف کی تکریم کو بھی دوٹوک الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ رب العزت نے یہ اصول دے دیا ہے کہ

انصاف کے بول بالا کے لئے منصف کی عزت و تکریم پر کوئی کمی بیشی گوارہ نہیں۔ کائناتِ ارضی کے پہلے منصف و محتسب حضور نبی اکرم ﷺ ہیں۔ قیامت تک کے لیے جتنے بھی منصف اس منصب پر فائز ہوں گے وہ بطورِ منصف پیغمبرِ حق کے نائب ہیں۔

☆ منصف کی تکریم کے حوالے سے اللہ رب العزت نے سورہ النساء میں فرمایا کہ وہ شخص ہر گز مسلمان نہیں ہو سکتا جو آپ ﷺ (منصفِ اعلیٰ) کے صادر کیے گئے فیصلے کو بہ خوشی قبول نہ کرے۔

☆ اللہ رب العزت نے سورہ المائدہ میں منصف کی ذمہ داریوں کا تعین بھی فرمادیا۔ فرمایا: اے نبی مکرم آپ اس کتاب کے مطابق فیصلے کریں، کسی کی خواہشات کی پیروی میں نہیں۔ یعنی قرآن مجید میں دو ٹوک یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ منصف عدل کرتے وقت انصاف کے تقاضوں کو ہر پہلو اور ہر جہت سے یقینی بنائے گا اور فیصلہ کرتے وقت کسی کی خواہش، کسی کے خوف، کسی کے لالچ اور ڈر کو آڑے نہیں آنے دے گا۔

☆ ایمان والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ انصاف پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو اور انصاف کرتے وقت اور گواہی دیتے وقت صرف اللہ کو دھیان میں رکھو۔ منصف کا کنڈکٹ اور گواہ کی گواہی صرف اللہ کے لئے ہے۔

☆ اللہ رب العزت نے حضور نبی اکرم ﷺ کی طرف وحی کرتے ہوئے حکم فرمایا کہ یہ بات عام فرمادیں کہ اللہ نے مجھے تمہارے درمیان عدل و انصاف کیلئے بطور عادل مبعوث کیا یعنی پیغمبرِ امن و سلامتی کی ایک شان اور وصف اُن کا عادل ہونا ہے۔

☆ اللہ رب العزت نے سورہ البقرہ میں فرمایا کہ ایک دوسرے کے مال کو ناحق مت کھایا کرو اور اپنا کام نکلوانے کے لئے بطورِ رشوت حاکموں تک پہنچانا بھی ایک بڑا گناہ ہے۔ یعنی رشوت لے کر غلط فیصلے دینا یا غلط کو ٹھیک قرار دینا تو ناقابلِ معافی جرم ہے ہی اگر کوئی شخص مرضی کا فیصلہ حاصل کرنے کے لئے یا اپنا کام نکلوانے کے لئے دولت کا استعمال کرتا ہے تو وہ اللہ کے نزدیک ایک بہت بڑے گناہ اور جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔

☆ نظامِ عدل اور انصاف کی اہمیت پر کتابِ ہدایت کا ایک ایک حرف آبِ زر سے لکھنے اور قلب و ذہن میں نقش کرنے کے لائق ہے۔ اللہ رب العزت نے منصف کے تقرر کے حوالے سے بھی کچھ ہدایات دی ہیں:

☆ سورۃ النساء میں حکم دیا کہ ایسے شخص کو منصف بناؤ جو امانت دار ہو اور ایسے لوگوں کو حاکم بناؤ جو ہر حال میں عدل و انصاف پر قائم رہیں اور لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر فیصلے کریں۔

انصاف کے عمل میں سازش، غلط بیانی کو بھی بہت بڑا گناہ اور جرم قرار دیا گیا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں ہم خود کو حق پر ظاہر کرنے کے لئے جائز و ناجائز کا سہارا لیتے ہیں۔ ایسے افراد اگر خود کو مسلمان اور ایمان والا سمجھتے ہیں تو وہ ذہن نشین کرلیں کہ اُن کا یہ عمل اللہ کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ اور قابل گرفت ہے۔

☆ عدل و انصاف کی اہمیت کے حوالے سے اللہ رب العزت نے سورۃ المائدہ میں ایک فکر انگیز اور چشم کشا ہدایت بھی دی ہے کہ منصف انصاف کرتے وقت کسی دشمن کی دشمنی کو بھی آڑے نہ آنے دے۔۔ اللہ نے فرمایا: مجھے عدل کرنے والے بہت پسند ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ پہلے والی اُمتیں جو تباہ ہو گئیں، اُن کے تباہ ہونے میں ایک علت یہ بھی تھی کہ وہ طاقتوروں کو جرم کا ارتکاب کرنے پر معاف کر دیتی تھیں جبکہ کمزور کی پوری گرفت کی جاتی تھی۔

عدل و انصاف کی اہمیت کے اعتبار سے قرآن و سنت کے مذکورہ دلائل سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ انصاف کے معاملے میں کسی کمی بیشی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ناانصافی سے معاشروں میں تباہی اور بگاڑ تو آتا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ روزِ قیامت اللہ رب العزت بھی کڑی گرفت کریں گے۔ انصاف ہی کمزوروں اور محروموں کی ڈھارس اور طاقت ہے۔ جب انصاف ناپید ہوتا ہے تو کمزور کی آہیں اور سسکیاں عرش تک بلند ہوتی ہیں اور پھر انصاف سے محروم معاشرے اللہ کی خیر و برکات سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

17 جون کو شہدائے ماڈل ٹاؤن کے ورثاء 10 ویں برسی منائیں گے۔ یہ 10 واں سال بھی انہیں انصاف سے محروم کی صورت میں گزارنا پڑ رہا ہے۔ ملکی تاریخ کا یہ واحد قتل و غارت گری کا کیس ہے کہ جس کی تاحال غیر جانبدارانہ اور منصفانہ تفتیش بھی نہیں ہو سکی اور غیر جانبدارانہ تفتیش نہ ہونے کی وجہ سے سانحہ ماڈل ٹاؤن کے کیس میں انصاف کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی بلکہ کچھ مہینوں سے صورت حال اور بھی دگرگوں ہو گئی ہے کہ انصاف میں تاخیر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ملزمان بریت کی درخواستیں لے کر پہنچ گئے ہیں اور ایک ایک کر کے بری ہو رہے ہیں۔ یہ طرزِ عمل انصاف کا قتل ہے۔ حکومت، قانون نافذ کرنے والے ادارے اور نظام عدل کی یہ آئینی، و قانونی اور انسانی و اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ مظلوموں کو انصاف دے اور انصاف کرتے وقت طاقتوروں کے خوف کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ یہ آئینی تقاضا ہی نہیں بلکہ اللہ رب العزت کا حکم بھی ہے۔ دعا کرتے ہیں کہ اللہ رب العزت ہمیں عدل و انصاف کی راہ پر گامزن کرے تاکہ ہمارے احوال درست ہو سکیں۔

(چیف ایڈیٹر: نوراللہ صدیقی)

حسد و عناد حق کے انکار کا سبب بنتا ہے

بغض سے دوسروں کی فضیلت تسلیم نہ کرنے کی منفی سوچ جنم لیتی ہے

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا خصوصی خطاب

حصہ 3

ترتیب و تدوین: محمد یوسف منہاجین

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ م بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًام بَيْنَهُمْ۔

”بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے اور اہلِ کتاب نے جو اپنے پاس علم آ جانے کے بعد اختلاف کیا، وہ صرف باہمی حسد و عناد کے باعث تھا۔“(آل عمران،۳: ۱۹)

قرآن مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں اس مضمون کے گزشتہ دو حصوں میں اس امر کی وضاحت کی گئی کہ ایک ہی دین، مذہب اور ملت میں بہت سے مسالک اور مکاتبِ فکر وجود میں آجانے اور تفرقہ پیدا ہونے کا سبب کیا ہے؟ اس حوالے سے ہم مطالعہ کر چکے ہیں کہ تفرقہ پیدا ہونے کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ لوگ اللہ رب العزت کی نازل کردہ اصل وحی کے منکر ہو جاتے ہیں بلکہ اس انکار کا بنیادی سبب یہ ہوتا ہے کہ جب نازل ہونے والی وحی، اللہ کی طرف سے اترنے والے احکام، تعلیمات اور عقائد و ہدایات کی تعبیر و تشریح کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہاں کئی ایسے عوامل جنم لے لیتے ہیں جو تعبیر و تشریح کرنے والوں کو گمراہ کر دیتے ہیں۔ اس گمراہی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ان کے قلب و باطن اور نفس کا تزکیہ نہیں ہوتا، قلب و باطن میں نورِ الٰہی نہیں ہوتا اور وحی الٰہی کے نور کے ساتھ اُن کے قلب و باطن کی مناسبت نہیں ہوتی۔

(خطاب نمبر:Ci-25)،(تاریخ:4 دسمبر 2013ء)

مذکورہ آیتِ کریمہ سے درج ذیل امور واضح ہو رہے ہیں:

۱۔ پہلی چیز جو اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمائی، وہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت کے ہاں دین تو اوّل دن سے اسلام ہی ہے۔ یعنی جملہ انبیاء کرام اور رسل عظام علیہم السلام جو دین اپنی امم کی طرف لے کر آئے، وہ بھی دین اسلام ہی تھا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے امت کو ''مسلمین'' کا نام دیا تھا۔ ارشاد فرمایا:

سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (الحج، ۲۲: ۷۸)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے راہِ حق پر چلنے والوں کا نام مسلمین رکھا گیا۔ حتیٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبۃ اللہ تعمیر کرتے ہوئے بھی یہی نام استعمال کرتے ہوئے عرض کیا تھا:

وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ۔ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔

'' ہم دونوں کو اپنے حکم کے سامنے جھکنے والا بنا اور ہماری اولاد سے بھی ایک امت کو خاص اپنا تابع فرمان بنا۔'' (البقرۃ، ۲: ۱۲۸)

گویا یہ کوئی نیا ٹائٹل نہیں ہے بلکہ اللہ رب العزت کے حضور ہمارا یہ ٹائٹل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے چلا آ رہا ہے۔

۲۔ اس آیتِ کریمہ کے دوسرے حصے میں فرمایا:

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ م بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۔ (آل عمران، ۳: ۱۹)

'' اور اہلِ کتاب نے جو اپنے پاس علم آ جانے کے بعد اختلاف کیا۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے تورات و انجیل کی صورت میں بنی اسرائیل کو جو علم دیا تھا، اُس علم کے آجانے کے بعد انھوں نے اختلاف کیا اور ان میں تفرقہ پیدا ہوا۔ یہاں دو چیزیں قابلِ غور ہیں:

(i) ایک اختلاف وہ ہے جو مبنی بر جہالت تھا اور وہ تورات اور انجیل کے نازل ہونے سے پہلے کا اختلاف تھا، جب اُن کے پاس علمِ حق نہیں آیا تھا۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت سے پہلے وہ گمراہ تھے اور شرک میں مبتلا تھے۔ اس وقت ان میں دھڑے، طبقے، فرقے اور گمراہی کا سبب یہ تھا کہ اُن کے پاس علم نہ تھا۔ اُس جہالت کو دُور کرنے کے لیے اللہ رب العزت نے انبیاء کرام علیہم السلام بھیجے۔ جہاں جہاں اللہ کا نبی آتا گیا، وہاں جہالت کی تاریکیاں ختم ہو گئیں۔ اس گمراہی، تفرقہ اور دھڑے بندیوں اور گمراہی کا ازالہ اور علاج علم نے کیا۔ مذکورہ آیت میں اس تفرقہ اور گمراہی کا ذکر نہیں ہو رہا جو علم کے آنے سے پہلے تھی۔

(ii) اس آیتِ کریمہ میں ان گمراہیوں، تفرقہ اور دھڑے بندیوں کا ذکر ہے جو علمِ حق آنے کے بعد وجود میں آئی ہیں۔ یعنی علمِ الٰہی، علمِ حق، کتاب، نبوت کی تعلیمات، ہدایت اور علم کے آجانے کے

بعد انہوں نے باہمی اختلاف کیا۔

اب اس آیت کے تناظر میں اس حدیث کا دوبارہ مطالعہ کریں کہ آقا ﷺ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے ساتھ اپنی امت کی مماثلت بیان فرما رہے ہیں کہ

لَيَأْتِيَنَّ عَلَى أُمَّتِي مَا أَتَى عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ۔

(ترمذی، السنن، ابواب الایمان، ۵: ۲۶، الرقم: ۲۶۴۱)

”میری امت پر وہ کچھ ضرور آئے گا جو بنی اسرائیل پر آیا جس طرح ایک جوتی دوسری جوتی کے برابر ہوتی ہے۔“

یعنی جو احوال بنی اسرائیل (یہود و نصاریٰ) پر بیتے، من و عن وہی احوال میری امت پر بھی بیتیں گے اور اسی طرح کی کیفیات میں میری امت بھی مبتلا ہو گی۔ گویا علم کے آجانے، قرآن کے نازل ہونے اور حضور ﷺ کی حدیث و سنت کی تعلیمات مل جانے کے بعد اسی طرح تفرقہ ہو گا، جیسے بنی اسرائیل میں تورات و انجیل اور علم آجانے کے بعد تفرقہ ہوا۔

زیرِ نظر سلسلہ وار تحریر میں ہم جس تفرقہ کے ازالے اور علاج کی کوشش کر رہے ہیں یا جس تفرقہ کے ماحول میں سچائی کی تلاش کر رہے ہیں اور حق و باطل اور درست اور غلط میں امتیاز کے لیے ایک methodology کے حصول کے لیے کاوش کر رہے ہیں، اس کی تائید قرآن مجید سے میسر آ رہی ہے کہ امتِ مسلمہ بھی بنی اسرائیل ہی کی طرح کے احوال کا شکار ہو گی۔

باہمی حسد و بغض کے باعث حق کا انکار کیا جاتا ہے

۳۔ اس آیت کریمہ کے تیسرے حصہ میں ارشاد فرمایا:

بَغْيًا م بَيْنَهُمْ۔ (آل عمران، ۳: ۱۹)

”وہ (اختلاف) صرف باہمی حسد و عناد کے باعث تھا۔“

جب علم یعنی تورات و انجیل کی تعلیمات ان تک پہنچ گئیں تو اس کے بعد ان میں جو اختلافات ہوئے، ان کا ایک سبب اُن کے دلوں کے اندر باہمی حسد، بغض، عداوت و عناد کا ہونا تھا۔ گویا علم، روشن دلیل، حق، ہدایت الغرض سب کچھ ہونے کے باوجود اُن کے دلوں میں ایک دوسرے کے ساتھ حسد تھا۔۔۔ ایک دوسرے پر بڑائی اور سبقت لے جانے کی دوڑ تھی۔۔۔ بغض، عناد اور عداوت تھی۔۔۔ ایک دوسرے کی فضیلت اور برتری کو تسلیم نہ کرنے کا رجحان تھا کہ ”میں بڑا ہوں، اس کی بات کیوں مان لی جائے، یہ کون

ہوتا ہے کہ اس کی بات کو قبول کیا جائے۔'' پس اُنہوں نے دوسروں کے پاس موجود حق کو محض حسد، بغض اور عناد کے باعث چھوڑ دیا اور اس چیز نے اُنھیں گمراہی میں دھکیل دیا۔

جو لوگ قلب و باطن کا تزکیہ اور تطہیر قلب کا اہتمام نہیں کرتے، جن کے دلوں پر زنگ اور غلاظت ہے، طہارت موجود نہیں تو پھر بارش (یعنی علم اور اللہ کی کتب) کے نازل ہونے کے باوجود بھی اُس دل کی گندی زمین پر اسی طرح بیماریاں اور تعفن جنم لیتا ہے۔

☆ یہ ہی بات اللہ تعالیٰ نے سورۃ الشوریٰ میں بھی بیان فرمائی۔ ارشاد فرمایا:

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْ م بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًام بَيْنَهُمْ

''اور انہوں نے فرقہ بندی نہیں کی تھی مگر اِس کے بعد جب کہ اُن کے پاس علم آ چکا تھا محض آپس کی ضد (اور ہٹ دھرمی) کی وجہ سے۔'' (الشوریٰ، ۴۲: ۱۴)

گویا علم، حق اور ہدایت کے آجانے کے باوجود وہ بغض و حسد اور دوسرے کی فضیلت و برتری کو تسلیم نہ کرنے کے سبب دھڑوں اور گروہوں میں بٹ گئے۔ اس بغض اور حسد نے انہیں تباہ کر دیا۔ حق پیچھے رہ گیا اور بغض بازی لے گیا۔ اس طرح اس سوچ نے پوری امت کو گمراہیوں کی بنیاد پر دھڑوں میں مبتلا کر دیا اور ان کے ہاں ۷۲ فرقے وجود میں آ گئے۔

مذکورہ آیات کی روشنی میں یہ امر واضح ہو گیا کہ بنی اسرائیل کے اندر جو تفرقہ ہوا، دھڑے اور گروہ بنے، اختلاف ہوئے حتیٰ کہ ۷۲ فرقے بنتے چلے گئے، قرآن مجید نے اس کا بنیادی سبب تکرار کے ساتھ یہ بیان کیا کہ حق اُن کے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں تھا، ہدایت تھی، کتاب تھی، آیاتِ ربّانی تھیں، پیغمبر کے فرمودات تھے، مگر اُن کی اپنی ہٹ دھرمی اور باہمی بغض آڑے آ گیا۔ اُن میں سے ہر شخص اپنی بڑائی کا طالب تھا۔۔۔ معاشرے میں اپنی فضیلت اور فوقیت دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔ سردار بننا چاہتا تھا کہ لوگ اُس کے پیروکار بنیں۔۔۔ اُس کی بات تسلیم کریں اور اسے اپنا امام اور پیشوا مانیں۔ اس حسد اور بغض و عناد کے سبب انھوں نے حق کو پیچھے چھوڑ دیا اور نئے نئے نظریے، مکاتبِ فکر، فرقے اور دھڑے بنے اور امت تفرقہ میں مبتلا ہو گئی۔

☆ صاحبِ تفسیر ابن کثیر سورۃ آل عمران کی آیت ۱۹ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

أی بغی بعضهم علی بعض فاختلفوا فی الحق لتحاسدهم وتباغضهم وتدابرهم فحمل بعضهم بغض البعض الآخر علی مخالفته فی جمیع أقواله وأفعاله وإن کانت حقا۔

(ابن کثیر، تفسیر، ۱: ۳۵۵)

یعنی بَغْیًام بَیْنَھُمْ کا مطلب یہ ہے کہ حق، ہدایت اور کتاب کی روشنی آنے کے باوجود اُنہوں نے اس حق کی تعبیر و تشریح میں اختلاف کیا۔۔۔ اُن آیات کی تشریح، تفسیر اور معانی بیان کرنے میں اختلاف کیا۔۔۔ ہر ایک نے متضاد معانی اور الگ الگ معارف اخذ کیے۔ الگ الگ اطلاقات کیے اور ان میں اختلاف کیا۔۔۔ حق کی شرح کرنے اور حق کو مختلف صورت حال پر پیش کرنے میں اختلاف کیا۔ ان کے ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف کی جڑ حسد اور بغض تھا، پس اس بغض نے انھیں دوسرے کی مخالفت کرنے پر مجبور کر دیا۔

نیز یہ کہ حسد، بغض اور عداوت پر مبنی یہ مخالفت کسی ایک پہلو سے نہ ہوتی بلکہ فی جمیع أقوالہ وأفعالہ وإن کانت حقا؛ بلکہ اگر وہ بندہ حق کہہ رہا ہو تب بھی اُس کی مخالفت کی جاتی ہے اور اگر صحیح اور درست عمل کر رہا ہے، تب بھی اس کے ہر فعل کی مخالفت کی جاتی۔ صرف اس لیے کہ اگر ہم نے اُس کی بات سچی مان لی تو پھر اُس کی برتری اور فضیلت ہو جائے گی اور وہ دوسرے کی برتری اور فضیلت کو ماننا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ اس حسد، بغض اور عناد نے اُنھیں حق سے پھیر دیا، علم کے صحیح معنی اور مفہوم کو سمجھنے سے محروم کر دیا اور دھڑے بندیوں، ٹکڑوں اور فرقوں میں تقسیم کر دیا۔

یہی کچھ آج ہمارے دور میں ہو رہا ہے کہ اگر کوئی شخص حق بات کہہ رہا ہے۔۔۔ قرآن و حدیث کا صحیح معنٰی بیان کر رہا ہے۔۔۔ صحیح معرفت، آگاہی اور شعور دے رہا ہے۔۔۔ حق اور باطل کا فرق بتا رہا ہے۔۔۔ تو دوسری طرف کچھ لوگ اس شخص کے ساتھ حسد، بغض، عناد اور اپنی بڑائی، فضیلت اور برتری کی خواہش کے سبب نہیں چاہتے کہ اس کی بات کو سنا جائے۔ قرآن مجید نے واضح کر دیا کہ محض حسد کی وجہ سے سچ اور حق بیان کرنے والے کی مخالفت کی جاتی ہے۔

بنی اسرائیل نے حسد، بغض اور اپنی برتری کی خواہش کے سبب رسالتِ محمدی کا انکار کیا

جس علم کے آجانے کے بعد بنی اسرائیل نے حسد، بغض اور عناد کے سبب اختلاف کیا، ائمہ نے اس علم سے حضور علیہ السلام کی فضیلتِ نبوت بھی مراد لی ہے۔ تورات اور انجیل میں حضور نبی آخر الزماں سیدنا محمد مصطفی ﷺ کی بعثت کے ذکر، آپ ﷺ کی شان کا بیان اور آپ ﷺ کے اوصاف و کمالات بیان ہوئے ہیں کہ ایک نبی آخر الزماں آئیں گے، اُن کی ولادت مکہ میں ہو گی، ہجرت مدینہ کی طرف ہو گی، چالیس برس کی عمر میں اُن کی بعثت ہو گی، وہ معراج پر جائیں گے، اُن کے اوصاف و کمالات یہ ہوں گے۔ ان تمام باتوں کو ائمہ تفسیر نے مِنْ مربَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ کی تفسیر میں علم قرار دیا ہے۔

امام قرطبیؒ بیان فرماتے ہیں:

إلا من بعد ما جاء هم العلم نبوة النبی فاختلفوا فیها (بغیا بینهم) أی حسدا علی النبی قال: معناه الضحاك قیل معنی بغیا أی بغی بعضهم علی بعض یطلب الفضل والریاسة وقتلوا الأنبیاء فکذا مشرکوا عصرك یا محمد قد جائتهم البینات ولکن أعرضوا عنها للمنافسة فی الریاسة۔

(قرطبیؒ، الجامع لاحکام القرآن، ۱۶: ۱۶۳)

بنی اسرائیل کو آقا ﷺ کے ساتھ حسد پیدا ہو گیا کہ ہم بنی اسرائیل میں سے ہیں اور یہ (رسول) بنی اسماعیل میں سے آئے۔ ہم تو اعلیٰ ہیں، اس لیے کہ کل انبیاء علیہم السلام ہماری نسل میں آئے، ہم پر تورات اور انجیل اتریں، ہم دینِ اسلام کے اصل وارث ہیں۔ اگر ہم اس نبی پر ایمان لے آئیں اور ان کا کلمہ پڑھ لیں تو ہم فوقیت اور فضیلت سے محروم ہو جائیں گے۔ پس آقا ﷺ کے ساتھ اس حسد نے انھیں گمراہ کر دیا اور انھوں نے حضور نبی اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت اور عظمت کو ماننے سے انکار کر دیا۔

مزید یہ کہ ان کے اندر معاشرے میں اپنی لیڈر شپ، قیادت اور فوقیت و برتری منوانے کی طلب، حرص اور لالچ تھی۔ پس اس طلب اور حرص کی وجہ سے انھوں نے حق اور سچائی کا انکار کر دیا۔ امام قرطبیؒ بیان کرتے ہیں:

فکذا مشرکوا عصرك یا محمد! قد جاءتهم البینات ولکن أعرضوا عنها للمنافسة فی الریاسة۔

(قرطبیؒ، الجامع لاحکام القرآن، ۱۶: ۱۶۳)

آپ ﷺ کے زمانے کے منکروں اور کافروں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ چاند کو ٹکڑے ہوتا دیکھ رہے ہیں، کنکریوں کو کلمہ پڑھتے دیکھ رہے ہیں، سورج کا پلٹنا دیکھ رہے ہیں، وہ دیکھ رہے تھے کہ درخت زمین کا سینہ چیر کر آپ کو سجدہ ریز ہو رہے ہیں، جانور آپ کو سجدے کر رہے ہیں، آپ کی زبان پاک سے نکلا ہوا ہر لفظ سچا ہو رہا ہے، وہ آپ ﷺ کی برکات، کمالات اور معجزات دیکھ رہے ہیں اور پچھلی کتابوں میں مذکور آپ کے فضائل پڑھ رہے ہیں، الغرض ہر چیز عیاں ہے اور حق ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے، اس ساری بات کے باوجود وہ صرف حسد اور ریاست کی طلب کے باعث آپ ﷺ کو ماننے سے انکار کر رہے ہیں۔

حسد اور بغض میں مبتلا بندہ دوسرے کی برتری کو تسلیم نہیں کرتا حتی کہ وہ نبوت و رسالت اور معجزات کا بھی انکار کر دیتا ہے۔ اب جب کہ کوئی نبی نہیں آئے گا، نہ کوئی کتاب اور وحی نازل ہو گی اور نہ کوئی صاحبِ معجزہ ہو گا تو اِس زمانہ میں حسد، بغض اور اپنی فضیلت و برتری اور ریاست و اقتدار کی طلب کیا کچھ کرواتی ہو گی، اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اگر نبی کے ہاتھوں چاند کے ٹکڑے ہوتے

دیکھ کر فقط حسد اور طلبِ ریاست نے حق کا انکار کروادیا تو امت میں آج اور آئندہ آنے والے زمانہ میں اپنی قیادت اور برتری تسلیم کروانے کے لیے کیا کچھ نہیں ہوتا ہوگا۔

پس واضح ہوا کہ بنی اسرائیل کا دینِ اسلام سے ٹکراؤ ریاست، لیڈر شپ اور برتری لینے کی وجہ سے تھا۔ ان کا انکار تورات اور انجیل پر نہیں تھا۔ اسی طرح آج امتِ مسلمہ میں اختلاف قرآن کے قرآن ہونے پر نہیں ہے، حدیث نبوی کے سچا ہونے پر نہیں ہے بلکہ اختلاف قرآن و حدیث کی تشریح اور تعبیر میں ہے اور اس اختلاف کا بنیادی سبب بھی حسد، بغض اور اپنی برتری و بغض و فضیلت کی خواہش ہے۔

امام قرطبیؒ بیان فرماتے ہیں:

ولا خلاف أن الله تعالیٰ لم یغایر بین الشرائع فی التوحید والمکارم والمصالح وإنما خالف بینهما فی الفروع۔

(قرطبیؒ، الجامع لاحکام القرآن، ۱۶: ۱۶۴)

اس چیز میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مختلف شریعتوں کی توحید، مکارم اور مصالح میں مغایرت پیدا نہیں کی بلکہ فرق صرف فروع میں ہے۔ سو اختلاف بھی فروع میں جنم لیتا ہے۔ اختلاف تشریح اور تعبیر میں جنم لیتا ہے۔ اصل سے جو مسائل اخذ کرتے ہیں، اُن میں اختلاف جنم لیتا ہے اور اس اختلاف کا بنیادی سبب عناد، عداوت، بغض، حسد، لیڈر شپ کی طلب اور دنیا پرستی کا ہونا ہے۔

قرآن مجید کی ان آیات نے یہ واضح کر دیا کہ اختلاف؛ طلبِ فضیلت، طلبِ ریاست اور باہمی بغض، حسد اور عناد کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان اختلافات کے سبب وہ دوسرے کی بات قبول نہیں کرتے اور ایک نیا نظریہ، نیا موقف، نئی تشریح اور نئی تعبیر دیتے ہیں اور بعد ازاں اس کی بنیاد پر ایک عقیدے، مسلک اور مکتبہ فکر کی عمارت قائم ہوتی چلی جاتی ہے۔

تفرقہ اور دھڑے بندی کی ممانعت کا سبب

قرآن مجید میں جابجا تفرقہ اور دھڑے بندی کی نہ صرف ممانعت فرمائی گئی ہے بلکہ اس کے اسباب بھی بیان کیے ہیں۔ ذیل میں چند آیات ملاحظہ ہوں:

۱۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا۔ (آل عمران، ۳: ۱۰۵)

”اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے تھے۔“

یعنی اے امت مسلمہ! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جنہوں نے باہمی حسد، بغض و عناد، عداوت اور اپنی لیڈرشپ کی طلب میں تفرقہ کیا، دھڑے بندی کی، ایک دوسرے کو برا بھلا کہا اور اپنے غلط موقف پیش کیے۔

۲۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَاخْتَلَفُوْا مِنْ م بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ۔

”اور جب ان کے پاس واضح نشانیاں آ چکیں اس کے بعد بھی اختلاف کرنے لگے۔“ (آل عمران، ۳: ۱۰۵)

۳۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ فَخَطَّ خَطًّا وَخَطَّ خَطَّيْنِ عَنْ يَمِينِهِ وَخَطَّ خَطَّيْنِ عَنْ يَسَارِهِ، ثُمَّ وَضَعَ يَدَهُ فِي الْخَطِّ الْأَوْسَطِ فَقَالَ هَذَا سَبِيلُ اللهِ۔ ثُمَّ تَلَا هَذِهِ الْآيَةَ (وَأَنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ)۔

(ابن ماجہ، السنن، المقدمۃ، ۶: ۱، رقم: ۱۱)

آقا علیہ السلام نے صحابہ کرام کی مجلس میں ایک خط (لائن) کھینچا اور پھر اس خط کے دائیں طرف ایک خط کھینچا اور پھر اس کے بائیں طرف بھی ایک خط کھینچا اور پھر درمیان والے خط پر ہاتھ رکھا اور فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے۔ پھر اس آیت (الانعام: ۱۵۳) کی تلاوت کی:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ۔ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ۔ (الانعام، ۶: ۱۵۳)

”اور یہ کہ یہی (شریعت) میرا سیدھا راستہ ہے سو تم اس کی پیروی کرو اور (دوسرے) راستوں پر نہ چلو۔ پھر وہ (راستے) تمہیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گے۔“

جب سیدھے راستے کی پیروی کا حکم دیا جارہا ہے تو لازمی بات ہے کہ اس سیدھے راستے کی پہچان کا کوئی ضابطہ اور کوئی قاعدہ ہوگا۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ ہر کوئی اپنی مرضی سے قرآن مجید سے چند آیات پڑھے اور پھر جو چاہے کہتا پھرے۔ لہذا قرآن و سنت کی تعبیر اپنی رائے سے نہیں بلکہ اس methodology سے ہونی چاہیے جو قرآن و سنت اور اللہ اور اس کے رسول نے دی۔

مذکورہ آیت میں قرآن مجید نے سیدھے راستے کی پیروی کا حکم دیتے ہوئے یہ امر بھی واضح فرمادیا کہ بہت سارے راستوں کی پیروی نہ کرو۔ قرآن مجید کے لفظ ”السُّبُل“ نے واضح کردیا کہ لوگ قرآن مجید کی آیات اور حدیث نبوی کے کئی معانی نکالیں گے، کئی تعبیرات اور تشریحات ہوں

گی، دعوت دینے والے علماء طرح طرح کے کئی راستے نکال لیں گے اور ہر راستہ ایک مکتبِ فکر، ایک مسلک اور فرقہ بنتا جائے گا مگر یہ سارے چھوٹے چھوٹے فرقے، مکاتبِ فکر اور چھوٹے چھوٹے دھڑے تمہیں اصل راہِ ہدایت سے ہٹا دیں گے۔

۴۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔

" ان (یہود و نصاریٰ) میں سے (بھی نہ ہونا) جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور وہ گروہ در گروہ ہوگئے، ہر گروہ اسی (ٹکڑے) پر اِتراتا ہے جو اس کے پاس ہے۔" (الروم، ۳۰: ۳۲)

قرآن مجید نے اس آیت میں یہ امر بھی واضح کر دیا کہ جس گروہ اور فرقے کے پاس چلے جاؤ، وہی اپنے آپ کو حق پر سمجھ رہا ہے اور اس پر خوش ہے۔۔۔ جو سودا اُن کے پاس ہے، وہ کہتا ہے کہ یہی درست ہے۔۔۔ جو تعبیر اور تشریح وہ کر رہا ہے، وہ اسے ہی درست مانتا ہے۔

آج یہ صورت حال اور نقشہ پوری امت مسلمہ میں بھی نظر آرہا ہے۔ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ فرقے بن گئے، دھڑے بن گئے اور ہر مسلک، ہر فرقہ اور ہر دھڑے کے پاس جو سودا ہے، وہ اُس پر خوش اور مطمئن ہے اور کہتا ہے کہ میری بات ہی درست ہے۔ اس صورت حال میں ہمیں اس راستے کو تلاش کرنا ہے جسے اللہ نے سیدھا راستہ قرار دیا ہے۔ ہم نے صرف اسی راستہ کی پیروی کرنا ہے اور ولا تتبعوا السبل کے مصداق بے شمار ان راستوں، تعبیرات اور تشریحات کو ترک کرنا ہے، جن کی تعبیر و تشریح قرآن اور حدیث نے نہیں کی تھی بلکہ ان لوگوں نے کی تھی جنہوں نے دوسروں کی برتری اور فضیلت تسلیم نہیں کرنی، حسد اور بغض کرنا ہے اور اپنی لیڈر شپ کو تسلیم کروانا ہے۔ ان کی اس خود ساختہ تعبیر و تشریح کے نتیجے میں فرقے، دھڑے اور جماعتیں بنتی گئیں۔ ہم نے اس کیفیت سے نبرد آزما ہوتے ہوئے راہِ حق کو تلاش کرنا ہے۔

۵۔ یہی مضمون ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا:

وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْ م بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ لا بَغْيًا م بَيْنَهُمْ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

" اور ہم نے ان کو دین (اور نبوّت) کے واضح دلائل اور نشانیاں دی ہیں مگر اس کے بعد کہ اُن کے پاس علم آچکا انہوں نے (اس سے) اختلاف کیا محض باہمی

حسد و عداوت کے باعث ، بے شک آپ کا رب اُن کے درمیان قیامت کے دن اس امر کا فیصلہ فرما دے گا جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔ پھر ہم نے آپ کو دین کے کھلے راستے (شریعت) پر مامور فرما دیا، سو آپ اسی راہ پر چلتے جایئے اور اُن لوگوں کی خواہشوں کو قبول نہ فرمایئے جنہیں (آپ کی اور آپ کے دین کی عظمت و حقّانیت کا) علم ہی نہیں ہے۔" (الجاثیہ، ۴۵: ۱۸،۱۷)

یعنی اتنی کھلی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی انہوں اختلاف کیا اور علم آجانے کے باوجود دھڑے اور فرقے بنادیے۔ آج ہمارے پاس قرآن، سنتِ نبوی اور حدیث کی صورت میں علم ہے مگر اس علم کے ہونے کے باوجود محض حسد، بغض، عناد، قلب و باطن کی سیاہی، لیڈر شپ اور برتری کی فضیلت کے حصول اور اس طرح کے دیگر امور نے دھڑے اور فرقے بنادیئے۔ نئے نئے کئی راستے کھول دیئے، جو جہنم میں لے جانے والے ہیں۔

آیت میں مذکور شریعة من الامر کا معنی امام قرطبیؒ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ای علی منهاج واضح من الأمر الدین۔ لأنه طریق إلی المقصد۔

(قرطبیؒ، الجامع لاحکام القرآن، ۱۶:۱۶۴)

یعنی ایک طریقہ دیا ہے جس کے ذریعے آپ مقصد تک پہنچ سکیں، حق تک پہنچ سکیں، صحیح اور غلط میں امتیاز کرسکیں۔ یعنی دین کے امور میں واضح methodology (منہاج الواضح) دی ہے، ایک واضح راستہ، طریقہ، سائنس، ضابطہ اور قاعدہ دیا ہے جس کے ذریعے آپ حق تک پہنچ سکیں اور امت کو حق کی طرف لے جاسکیں۔

جو لوگ حق کو نہیں پہنچانتے، ان کے بارے میں امت کو کہا جا رہا ہے کہ ان کی خواہشاتِ نفس کی پیروی نہ کریں۔ دین آپ کی اور میری مرضی سے تشکیل نہیں پاتا، حق میری اور آپ کی ذاتی تعبیر سے نہیں بنتا بلکہ حق وہ ہے جو شریعة من الامر (methodology) سے بنتا ہے۔ جو اللہ اور رسول کے دیئے ہوئے واضح احکام اور طریقے سے ثابت ہو، وہ حق ہے اور جو اس سے ہٹ کر ہو وہ حق نہیں ہوتا۔

(جاری ہے)

آپ کے فقہی مسائل

حج وحدتِ اُمت کا ذریعہ

دارالافتاء تحریک منہاج القرآن، زیرِ نگرانی: مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی

اسلامی فلسفہ زندگی اور اسلامی قانون واحکام دنیا کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے جسے اپنا کر دنیا کے تمام غموں سے چھٹکارا پایا جاسکتا ہے اور صرف آخرت ہی نہیں، اس زندگی کو بھی قابلِ رشک بنایا جاسکتا ہے۔ قرآن وسنت سے دوری سے صرف مسلمان ہی اس کی خیر وبرکت سے محروم نہیں ہوئے بلکہ تمام عالمِ انسانیت اس چشمۂ حیات کے فیض وبرکت سے محروم ہوگئی۔ آج دنیا مختلف علوم وفنون سے فیضیاب ہورہی ہے۔ زمین نے اپنے خزانوں کی کنجیاں نوعِ انسانی کے سپرد کردیں۔ تحقیق وتفتیش کے نت نئے ذرائع فطرت کے پوشیدہ خزانوں کو بے نقاب کررہے ہیں۔ علوم وفنون کے تنوع نے ترقی کی نئی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اس تمام ترقی کے باوجود امنِ عالم کے لئے کی جانے والی تمام کاوشیں اسلامی احکام کی نقالی کرنے کی ناکام کوشش ثابت ہوئیں اور صدیاں گزرنے کے باوجود اصل کی خُوبُو بھی حاصل نہ کرسکیں۔

حج کی صورت میں مسلمانوں کا عظیم الشان اجتماع دور دراز کے مسلمانوں، عوام وخواص، مختلف رنگوں، نسلوں، زبانوں کے بولنے والوں، مختلف الانواع تہذیب وثقافت، تمدن کے حامل مگر ایک دین کے پیروکاروں کے ایک دوسرے سے ملنے کا ایک موقع ہے۔ اس کا ایک مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا باہمی تعارف ہو، ایک دوسرے کے مسائل ومشکلات سے آگاہ ہوں اور یہی ان کا بین الاقوامی مرکز قرار پائے۔ اس سے مسلمانوں میں باہمی رابطے مضبوط ہوں۔۔۔ ان کے حکمران علاقائی مسائل کو زیرِ بحث لائیں۔۔۔ مظلوم جہاں کہیں ہوں ان کی سیاسی، مالی اور اخلاقی مدد کریں۔۔۔ حوادث، سانحات، قحط،

سیلابوں، زلزلوں اور مظالم کا شکار بھائیوں کے مصائب کا ادراک واحساس کریں۔۔۔ان کے ازالہ کی تدبیریں اور عملی جدوجہد کریں۔۔۔اپنے قدرتی وسائل کو حقداروں پر خرچ کریں۔۔۔اپنی معیشت کو مضبوط کریں۔۔۔اپنے عوام کی تعلیم، صحت، صنعت، حرفت، زراعت کو ترقی دیں۔۔۔اپنا دفاع، اپنی آزادی، اپنی عزت اور عظمت رفتہ کی بحالی پر اپنے وسائل خرچ کریں۔

قرآن مجید میں کس فصاحت وبلاغت سے یہ بات بتائی گئی اور ان مقاصد کے حصول کا حکم دیا۔ارشاد ہوا:

لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ۔ (الحج:۲۸)

"تاکہ وہ اپنے فوائد (بھی) پائیں۔"

حضرت صدرالافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادیؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"دینی اور دنیوی فوائد جو اس عبادت (حج) کے ساتھ خاص ہیں، دوسری عبادات میں نہیں پائے جاتے۔"

علامہ اقبالؒ نے حج کی کتنی خوبصورت ترجمانی کی ہے:

؎ طاعتے، سرمایۂ جمعیتے
ربطِ اوراق کتاب ملتے

"(حج) اللہ تعالیٰ اور رسول پاک ﷺ کی اطاعت ہے، وحدت امت کا سرمایہ وذریعہ ہے، کتاب ملت کے منتشر اوراق (یعنی افراد امت) کی جلد بندی ہے۔"

حج ایک ایسی عبادت ہے جس میں اتحاد، یقین اور نظم کے فوائد نہ صرف امت مسلمہ کے لئے بلکہ تمام دنیا کے لئے پنہاں ہیں۔اس سے یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبت فاتح عالم کے انوار کی خیرات بٹتی ہے مگر ہم اپنے حکمرانوں کی نااہلی کے سبب ان انوار و برکات سے محروم ہیں۔آج امت کہاں کہاں کس حال میں ہے۔۔۔؟ ہمارے حاکم ہمارے خادم ہیں یا خدام۔۔۔؟ دور و نزدیک سے عوام کی آواز بااختیار لوگوں تک پہنچتی ہے یا راہوں میں ہی بھٹکتی ہے۔۔۔؟ مظلوم کی ہر سطح پر دادرسی ہو رہی ہے یا ظالم کو تحفظ اور مظلوم کو دھتکارا جاتا ہے۔۔۔؟ کیا حکمرانوں اور بااثر طبقات کی زیادتی اور مظلوم کی فریاد کو دیکھا سنا اور موقع پر بدلہ دیا جاتا ہے یا مظلوم کو دھتکار دیا جاتا ہے۔۔۔؟ ناحق قتل وغارت کرنے والوں کو فوراً سرعام سزا ملتی ہے یا شیطانی آنت کی طرح عمر بھر کے لئے انکوائری کمیٹیاں ہی بنتی رہتی ہیں۔۔۔؟

ذرا چشم تصور میں دور اول کی برکات لے کر آئیں۔جب ہر ذی استطاعت مسلمان اپنے مرکز میں حاضر ہوتا تھا اور اُسے عدل وانصاف ملتا تھا۔۔۔اپنے حقوق کے حصول کے لئے اُسے دھکے نہیں کھانے پڑتے تھے۔۔۔حج کے اس عظیم اجتماع عام میں جرائم کی فوری شنوائی، سزاؤں کا فوری نفاذ اور چھوٹے بڑے کی تمیز کئے بغیر عدل وانصاف کے ساتھ فیصلے اور ان پر عملدرآمد ہوتا تھا۔۔۔علاقائی ومرکزی حکام

کو نماز پنجگانہ، نماز جمعہ و عیدین اور حج کے موقع پر عوام کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کاش کہ یہ منظر پھر سے زندہ ہو جائے اور حج ایک مرتبہ پھر امتِ مسلمہ کی وحدت کے ایک عملی مظہر کے طور پر سامنے آسکے۔

حج کی فضیلت

حج اسلام کا بنیادی رکن ہے اور یہ ہر اس شخص پر زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے جو صاحبِ استطاعت ہو۔ حج، اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک ایسا رکن ہے جو اجتماعیت اور اتحاد و یگانگت کا آئینہ دار ہے۔ قرآن کریم میں حج کی فضیلت واہمیت کا اندازہ درج ذیل آیتِ مبارکہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا۔

”اور جو اس میں داخل ہوگیا امان پا گیا، اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج فرض ہے جو بھی اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو۔“ (آل عمران:۹۷)

اللہ رب العزت کے مقدس گھر کی زیارت اور حج کرنے کے لیے حاضر ہونے والے یہ نفوس ہر قسم کی برائی کا خاتمہ کرنے کا عہد کرتے ہوئے نیکیوں کے حصول کی جانب ایک نئے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص زندگی میں استطاعت کے باوجود حج نہ کرے تو وہ ربِ کائنات کی رحمتوں سے نہ صرف محروم ہو جاتا ہے بلکہ ہدایت کے راستے بھی اس کے لئے مسدود ہو جاتے ہیں۔

استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ کرم سے نکال دیتا ہے۔ حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ لَمْ يَمْنَعْهُ مِنَ الْحَجِّ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ أَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ أَوْ مَرَضٌ حَابِسٌ، فَمَاتَ وَلَمْ يَحُجَّ فَلْيَمُتْ إِنْ شَاءَ يَهُوْدِيًّا وَإِنْ شَاءَ نَصْرَانِيًّا۔

جس شخص کو فریضۂ حج کی ادائیگی میں کوئی ظاہری ضرورت یا کوئی ظالم بادشاہ یا روکنے والی بیماری (یعنی سخت مرض) نہ روکے اور وہ پھر (بھی) حج نہ کرے اور (فریضہ حج کی ادائیگی کے بغیر ہی) مر جائے تو چاہے وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر (اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی فکر نہیں ہے)۔

(ترمذي، السنن، ٣:١٧٦، رقم:٨١٢)

جبکہ دوسری طرف اس عظیم سعادت کو حاصل کرنے والے کو بخشش کی نوید سناتے ہوئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْحُجَّاجُ وَالْعُمَّارُ وَفْدُ اللهِ۔ إِنْ دَعَوْهُ أَجَابَهُمْ، وَإِنِ اسْتَغْفَرُوْهُ غَفَرَ لَهُمْ۔

حج اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں، وہ اس سے دعا کریں تو ان کی دعا قبول کرتا ہے اور اگر اس سے بخشش طلب کریں تو انہیں بخش دیتا ہے۔

(ابن ماجہ، السنن، ۲: ۹، رقم: ۲۸۹۲)

حج ایک ایسا عمل ہے کہ اگر بندہ اس کے آداب اور تقاضوں کو ملحوظ رکھتا ہے اور مناسک حج کی ادائیگی کے دوران صدق و اخلاص کا پیکر بنے اللہ کی بارگاہ میں حاضر رہتا ہے اور اپنے ماضی پر شرمندہ ہوتے ہوئے آئندہ گناہ و نافرمانی کا مرتکب نہ ہونے کا عہد کرتا ہے تو ایسے بندے کے لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ۔

جو رضائے الٰہی کے لیے حج کرے جس میں نہ کوئی بیہودہ بات ہو اور نہ کسی گناہ کا ارتکاب۔ وہ ایسے لوٹے گا جیسے اس کی ماں نے ابھی جنا ہو۔ (بخاري، الصحیح، ۲: ۵۵۳، رقم: ۱۴۴۹)

ایک اور مقام پر حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اَلْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا، وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ۔

ایک عمرہ سے دوسرے عمرہ تک کا درمیانی عرصہ گناہوں کا کفارہ ہے، اور حج مبرور (مقبول) کا بدلہ جنت ہی ہے۔

(بخاري، الصحیح، ۲: ۹۲۹، رقم: ۱۶۸۳)

پس جسے بھی حج و عمرہ کی سعادت نصیب ہو، اسے صدقِ دل سے اور خلوصِ نیت کے ساتھ اس عمل کو اچھی طرح سرانجام دینا چاہیے۔ گناہوں کی معافی اور حج کے اجر و ثواب کی مقدار کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اس کی مرضی جتنا اجر دے۔ یہ تو ایک عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ ایک شخص گناہ گار اور سیاہ کار ہو، وہ صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرمانے والا ہے، اس کو معاف فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ تو نیتوں کے بھید جانتا ہے۔ صدقِ دل اور خلوصِ نیت ہو تو بعید نہیں سب کے سب گناہ معاف ہو جائیں۔ اگر کوئی حج کرنے کے بعد بھی ظلم و ناانصافی اور حقوق کی پامالی کا مرتکب ہوتا رہے تو اس کے حج و عمرہ، نماز، روزہ وغیرہ اس کے لیے فائدہ مند نہیں ہوں گے بلکہ اُسے اپنی بداعمالیوں پر اللہ کے حضور جوابدہ ہونا ہوگا۔

مسائل حج

سوال: کیا کوئی شخص اپنی طرف سے کسی کو حج پر بھیج سکتا ہے؟

جواب: اگر کوئی شخص انتہائی کمزوری کی وجہ سے حج نہ کر سکے تو کسی اور کو اپنی طرف سے حج پر بھیج سکتا ہے۔ یہ دوسرا شخص اس کی طرف سے حج و عمرہ کرے گا۔ اسے حج بدل کہا جاتا ہے۔ خشعم قبیلہ کی

ایک بی بی نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ حج کا حکم آیا ہے مگر میرے والد بوڑھے ہیں، سواری پر بیٹھ نہیں سکتے، کیا میں ان کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ فرمایا: ہاں۔ (متفق علیہ)

ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کی میری بہن نے حج کی نذر مانی مگر وہ وفات پاگئی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لوکان علیھا دین اکنت قاضیہ قال نعم۔

اگر اس پر قرض ہوتا تو تم ادا کرتے؟ وہ بولے: جی ہاں! فرمایا:

فاقض دین اللہ فھو احق بالقضاء۔ (متفق علیہ)

تو پھر اللہ کا قرض بھی ادا کرو کہ یہ ادائیگی کا زیادہ حقدار ہے۔

سوال: اگر والدین مقروض ہوں اور بیٹا صاحب استطاعت ہو تو بیٹے کے حج کا کیا حکم ہے؟

جواب: اگر کوئی شخص اپنے ذاتی مال و دولت سے استطاعت رکھتا ہے تو اس پر حج فرض ہے اور فرض حج میں والدین کی اجازت ضروری نہیں، بلکہ والدین کو ممانعت کا اختیار نہیں۔ اس پر لازم ہے کہ حج کرے، اگرچہ والدین منع کریں۔ والدین کا مقروض ہونا اس شخص پر فرضیت حج میں خلل انداز نہیں۔ ہاں اگر وہ شخص خود مقروض ہے تو مقروض ہونے کی صورت میں پہلے قرض ادا کرنا لازم ہے، اس کے بعد حج کیا جائے گا۔

سوال: گھریلو ضروریات اور حج میں سے کس کو ترجیح دی جائے؟

جواب: بندہ سب سے پہلے ضروریات زندگی کو پورا کرے۔ اپنے ذمہ عائد فرائض و ذمہ داریاں ادا کرے مثلاً اگر غیر شادی شدہ بہن بھائی، اولاد ہے اور وہ شادی کے قابل ہیں پہلے تو ان کی شادی کی جائے تاکہ وہ گناہ کی طرف نہ چلے جائیں۔ رہائش کے لئے مکان نہیں ہے، اسے حاصل کر لیا جائے۔ المختصر اگر ضروریات زندگی کے علاوہ آپ کے پاس اتنے پیسے ہیں کہ آپ حج کر سکتے ہیں تو کر لیں۔

احوالِ قلب اور نفس و روح کے مابین جنگ

ڈاکٹر حسن محی الدین قادری
(چیئرمین سپریم کونسل منہاج القرآن انٹرنیشنل)

اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ۔

" اللہ نے کسی آدمی کے لیے اس کے پہلو میں دو دِل نہیں بنائے۔" (الاحزاب، ۳۳:۴)

اللہ رب العزت نے انسانی جسم میں دل کے علاوہ باقی اعضاء کو جوڑے کی شکل میں بنایا۔ دیکھنے کے لیے دو آنکھیں، سماعت کے لیے دو کان، چلنے کے لیے دو پاؤں، چھونے کے لیے دو ہاتھ، اسی طرح دو گردے اور سانس کا نظام چلانے کے لیے دو پھیپھڑے بنائے۔ انسانی جسم کے نظام میں دل کا ایک ہونا اللہ تعالیٰ کی شانِ وحدت کی جھلک کی علامت ہے۔ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری فرماتے ہیں کہ جب اللہ رب العزت نے کائنات کی ہر شے کو زوج اور جوڑے میں پیدا کیا تو دل نے پوچھا ہوگا کہ میرا جوڑ کیا ہے جس کے ساتھ تو مجھے جوڑے گا؟ تو اللہ نے فرمایا ہوگا کہ اے دل باقی ہر شے کو دوسرے کے ساتھ جوڑا، تجھے میں نے اپنے ساتھ جوڑ لیا۔ میں بھی ایک ہوں اور تجھے بھی ایک ہی رکھا اور اگر کوئی مجھے تلاش کرنا چاہے گا تو مجھے تیرے (دل) اندر ہی پالے گا۔

اللہ رب العزت کو دل سے بہت پیار ہے، اسی لیے وہ اس میں رہتا ہے۔ دل کے ساتھ اس کی محبت کا عالم یہ ہے کہ قرآن مجید میں اس نے بقیہ انسانی اعضاء کی نسبت سب سے زیادہ تذکرہ قلب (دل) کا ہی کیا ہے۔ کیونکہ جسے جس چیز سے جتنا زیادہ پیار ہوتا ہے، وہ اس کا تذکرہ اتنا ہی زیادہ کرتا ہے۔

دل کا ایک نام ''فواد'' ہے، اس کا تذکرہ قرآن مجید میں 16 مرتبہ آیا ہے۔ ''قلب'' کا تذکرہ قرآن مجید میں 133 مرتبہ آیا ہے۔ صدر جس میں یہ قلب موجود ہوتا ہے، اس کا تذکرہ 46 مرتبہ آیا ہے اور ''باطن'' کا ذکر ایک مرتبہ آیا ہے۔ جبکہ دوسری طرف ''جسم'' کا ذکر 2 دفعہ آیا ہے۔ جسد بھی ظاہری جسم کو کہتے ہیں، اس کا ذکر 4 مرتبہ آیا ہے اور مجموعی طور پر ''ظاہر'' کا ذکر ایک مرتبہ آیا ہے۔ 133 مرتبہ قلب کے تذکرہ سے عیاں ہے کہ اللہ کو دل کتنا محبوب ہے اور جسم کی طرف اس نے گویا توجہ ہی نہیں فرمائی، جس بنا پر اس کا ذکر صرف 2 مرتبہ کیا۔ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ وَلَا إِلَى صُوَرِكُمْ وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَشَارَ بِأَصَابِعِهِ إِلَى صَدْرِهِ۔
(مسلم، الصحیح، باب تحریم ظلم المسلم، ۱۲: ۴۲۶، الرقم: ۶۵۰۴)

اللہ تو نہ تمہارے جسموں کو دیکھتا ہے نہ صورتوں کو بلکہ وہ تو تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔ اور یہ فرماتے ہوئے آپ ﷺ نے اپنی انگلی مبارک سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔

دوسری روایت میں ہے کہ

إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ۔
(مسلم، الصحیح، باب تحریم ظلم المسلم، ۱۲: ۴۲۶، الرقم: ۶۵۰۱)

بے شک اللہ تمھاری صورتوں اور تمھارے اموال کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمھارے دلوں اور اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔ گویا وہ دل کے اعمال رجحانات، میلانات اور رغبات کو دیکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اعضائے جسمانی میں سے زبان کو بھی ایک ہی بنایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق بھی دل کے ساتھ ہے۔ ارشاد فرمایا:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ۔ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ۔ (البلد، ۹۰: ۸، ۹)

''کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں نہیں بنائیں۔ اور (اسے) ایک زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیے)۔''

اللہ تعالیٰ نے جس طرح دل ایک بنایا، اسی طرح دل کے احوال و کیفیات، چاہت، معاملات اور رغبات کا پتہ چلانے کے لیے زبان بھی ایک ہی بنائی۔ دل ایک ہو مگر اس کے ترجمان دو ہوں تو بات

نہیں بنے گی۔ ایک کچھ اور خبر دے گا دوسرا کوئی اور خبر دے گا۔ اس لیے اس نے چاہا کہ جب دل ایک ہے تو اس کا نمائندہ بھی ایک ہونا چاہیے۔ اللہ رب العزت نے دل کے اس ترجمان یعنی زبان کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے کہ کہیں خبر دیتے ہوئے پھسل نہ جائے، دو ہونٹ بنا دیئے تاکہ یہ دونوں ہونٹ مل کر زبان کو کنٹرول میں رکھیں اور زبان دل کے حقیقی احوال و کیفیات اور خواہشات و تمناؤں کو لوگوں کے سامنے بیان کرے۔

انسانی جسم میں دل کی ہیئت اور افعال

۱۔ اللہ رب العزت نے دل کا نظام چلانے کے لیے اس کے چار چیمبرز اور خانے بنائے۔ ان خانوں، چیمبرز کے لیے اس نے ایک طریقہ کار بنایا ہے تاکہ دل دھڑکتا رہے اور اپنا کام سرانجام دیتا رہے۔

۲۔ اس دل کے valves بنائے تاکہ یہ خون کو جسم کے دوسرے حصوں تک منتقل کرتے رہیں۔ پھر ان valves کے ذریعے خراب خون کو جمع کر کے اس کی صفائی و تطہیر کے بعد صاف شفاف حالت میں واپس جسم میں موجود خون کی نالیوں میں آگے بھیجتا ہے تاکہ یہ تازہ خون جسم کے اعضاء کو توانا رکھ سکے، انسانی جسم کی بہتر نشوونما ہو سکے اور اعضاء اچھے طریقے سے اپنا کام سرانجام دے سکیں۔

۳۔ دل کا ایک عمل یہ بھی ہے کہ یہ پھیلتا اور سکڑتا بھی ہے۔ سکڑنے کی حالت کو انقباض کہتے ہیں اور پھیلنے کی حالت کو انبساط کہتے ہیں۔ حالتِ اطمینان و سکون اور حالتِ انبساط؛ فرحت و شادمانی کی حالت ہے جبکہ انقباض تنگی اور بے چینی کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب دل انبساط یعنی پھیلنے کی حالت میں ہوتا ہے تو خون دیتا ہے اور جب انقباض یعنی سکڑنے کی حالت میں ہوتا ہے تو خون لیتا ہے۔

۴۔ اللہ رب العزت نے اسی دل کے میکنزم میں layers (تہیں) بنائی ہیں۔ ایک تہہ دل کے بیرونی حصے کی حفاظت کرتی ہے۔ پھر درمیانی اور اندرونی تہیں ہیں تاکہ براہ راست کوئی چیز دل پر اثر انداز نہ ہو اور دل محفوظ رہے۔

۵۔ اگر روزمرہ کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کبھی مرجھایا ہوا اور بیمار بیمار نظر آتا ہے اور ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ وہ چلتے چلتے گرنے لگتا ہے، چکر آنے لگتے ہیں حتی کہ جسم کمزور ہونے لگتا ہے۔ اگر کسی پر ایسی حالت طاری ہو اور اس کے بارے میں پوچھا جائے تو بتاتا ہے کہ پتہ نہیں کھاتا پیتا بھی اچھا ہوں مگر جو کھاتا ہوں وہ جسم کو لگتا نہیں ہے۔ جب وہ ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے تو وہ بتاتا ہے کہ تیرا دل کمزور ہو رہا ہے جس کی وجہ سے دل کی دھڑکن آہستہ ہو گئی اور شریانیں بند ہونا شروع ہو گئیں۔ اگر یہ بیماری ابتدائی سٹیج پر ہو تو stent سے کام چل جاتا ہے، اگر اس سے زیادہ کام

خراب ہو تو انجیو گرافی کراتے ہیں اور اگر اس سے بھی معاملہ بڑھ جائے تو بائی پاس ہوتا ہے۔

۶۔ بائی پاس کے بعد دل کی حفاظت کے لیے پورے جسم کا نظام اور میکنزم بدلنا پڑتا ہے۔ بندہ اپنی مرضی اور پسند کی خوراک نہیں لے سکتا۔ معالج کہتا ہے کہ اب تیرے جینے اور مرنے کی ضمانت اللہ کے بعد تیرے دل کے پاس ہے۔ اگر تیرے دل کی صحت ٹھیک رہے گی تو تو سلامت رہے گا۔ اس لیے کہ دل ایک ہے اور اس کا کوئی back up اور متبادل بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایک آنکھ تلف ہو تو دوسری آنکھ back up کے طور پر موجود ہے، اگر ناک کی ایک طرف بند ہوتی تو دوسرے حصے کی نالی back up کے طور پر موجود ہے۔ اگر ایک کان بند ہوتا تو دوسرا سماعت کے لیے موجود ہے۔ اسی طرح ایک ہاتھ، پاؤں یا گردہ تلف ہوتا تو دوسرا حصہ back up کے طور پر موجود ہے۔

دل چونکہ ایک ہے، اس لیے اگر اس کی حفاظت کی جائے گی تو زندہ رہنا ممکن ہوگا ورنہ اس کے بند ہوتے ہی بندہ اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ اب مریض ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرنا شروع کر دیتا ہے کیونکہ اس کو ظاہری زندگی سے پیار ہے، وہ اپنے کھانے پینے کی خواہشات کو پس پشت ڈال دیتا ہے، اپنی چاہت اور رغبت کو قربان کر دیتا ہے۔ گویا وہ دل کو بچانے کے لیے ظاہری نظامِ حیات کو ہی تبدیل کر دیتا ہے۔ وہ مریض ڈاکٹر کے کہنے پر پرہیز کرتا ہے تاکہ دل سلامت رہ جائے اور وہ اس دنیا میں مزید چند روز گزار سکے۔

باطنی دنیا اور احوالِ قلب

دل کی اس ظاہری کیفیت اور اس کے افعال کا مطالعہ کرنے کے بعد آیئے اب باطن کی دنیا میں بھی نگاہ ڈال کر دیکھیں کہ وہاں دل کا حال کیا ہے؟

۱۔ جسمانی قلب اور باطنی قلب کا طبیب الگ الگ ہوتا ہے۔ جسمانی قلب کا طبیب کارڈیالوجسٹ دل کی بند شریانوں کو کھولتا ہے جبکہ روحانی طبیب دل کو میت ہونے سے بچاتا ہے۔ دل کے ظاہری لوازمات پورے کر دیں تو دل کام کرنے لگ جاتا ہے اور خون کی سپلائی جاری کر دیتا ہے جبکہ روحانی لوازمات پورے کر دیں تو وہ دل قلبِ میت سے قلبِ سلیم اور قلبِ منیب بن جاتا ہے۔

۲۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ۔

(بخاری، الصحیح، باب فضل من استبرا لدینہ، ۱: ۹۰، الرقم: ۵۰)

خبردار تمھارے جسم کے اندر گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اگر وہ صحیح ہو جاتا ہے، اسے خیر مل جاتی ہے تو تمہارے پورے جسم کو خیر مل جاتی ہے۔ اگر وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ جان لو کہ وہ گوشت کا ٹکڑا دل ہے۔

☆ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دل کی کیفیات سے متعلق پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْقَلْبُ مَلِكٌ وَالْأَعْضَاءُ جُنُودُهُ فَإِذَا طَابَ الْمَلِكُ طَابَتْ جُنُودُهُ وَإِذَا خَبُثَ الْمَلِكُ خَبُثَتْ جُنُودُهُ۔ (کنز العمال، ہندی، فصل فی خطرات القلب وتقلبہ، ۱: ۱۳۲، رقم: ۱۲۰۵)

دل بادشاہ ہے اور جسم کے سارے اعضاء اس کی فوج ہیں۔ اگر بادشاہ خیر اور بھلائی پر قائم ہو گا تو سمجھ لو اس کی پوری فوج بھلائی اور خیر پر گامزن ہو گی۔ اگر بادشاہ خبیث اور کرپٹ ہو گیا تو ساری کی ساری فوج کرپٹ ہو جائے گی۔ پس باطن کی وادی کا دار و مدار دل پر ہے۔

۳۔ دل کی باطنی بیماریوں کا علاج روحانی معالج کے پاس ہوتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قلوب کے روحانی معالج حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو جایا کرتے تھے اور دل کے احوال سے آگاہ کرتے۔ ایک دفعہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھامے تشریف لے جا رہے تھے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کی:

لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِلَّا مِنْ نَفْسِي فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ۔

میں سوائے اپنی جان کے، ہر شے سے بڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں اے عمر! جب تک میں تجھے تیری جان سے بھی بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں، تیرا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سچ بول دیا کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے دل کا علاج بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے کرواتے تھے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرماتے ہوئے اپنا دستِ اقدس حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قلب پر رکھ دیا اور قلبِ عمر پر نگاہ فرمائی۔ جب سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دست اقدس کی ٹھنڈک محسوس کی تو عرض کی:

فَإِنَّهُ الْآنَ وَاللهِ لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِي فَقَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الْآنَ يَا عُمَرُ۔ (بخاری، الصحیح، باب کیف کانت یمین عن النبیؐ، ۲۰: ۳۱۴، الرقم: ۶۱۴۲)

یارسول اللہ ﷺ اب میں اپنی جان سے بھی بڑھ کر آپ ﷺ سے محبت کرنے لگا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے عمر اب تیرا ایمان مکمل ہو گیا۔

دل کی اقسام

دل کبھی صحت مند ہوتا ہے اور کبھی بیمار ہو جاتا ہے اور کبھی اس پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ دل پر وارد ہونے والی کیفیات اور احوال کے لحاظ سے ذیل میں اس کی چند اقسام کا تذکرہ کیا جا رہا ہے:

(۱) قلبِ سلیم: دل کی ایک قسم قلبِ سلیم ہے۔ یہ بے عیب دل ہوتا ہے۔ یہی وہ دل ہے جس میں خدا کی ذات جلوہ افروز ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اس کا تذکرہ یوں آیا ہے:

إِلَّا مَنْ أَتَى اللهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ۔ (الشعراء، ۲۶: ۸۹)

مگر صرف وہی شخص نفع مند ہو گا جو اللہ کی بارگاہ میں سلامتی والے بے عیب دل کے ساتھ حاضر ہو گا۔

(۲) قلبِ منیب: ایسا دل جو رجوع اور انابت والا ہو، اسے قلبِ منیب کہتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا:

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُنِيبٍ۔ (ق، ۵۰: ۳۳)

جو خدائے رحمان سے ڈرتا رہے اور اس کی خشیت اور خوف کا پیکر بن کر اس کے پاس آئے تو کہا جائے گا کہ یہ بندہ قلبِ منیب کے ساتھ آیا ہے۔

(۳) القلب المتقی: دل کی تیسری قسم "القلب المتقی" ہے۔ متقی دل کے بارے میں فرمایا:

ذَلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ (الحج، ۲۲: ۳۲)

جو اللہ کے شعائر اور نشانیوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ تعظیم متقی دل کی وجہ سے ہے۔ یعنی اللہ کی نشانیوں کی تعظیم وہی کرتا ہے جس کا دل متقی ہو چکا ہوتا ہے۔

(۴) القلب المطمئن: دل کی چوتھی قسم القلب المطمئن ہے۔ یہ وہ دل ہے جو اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات اور نشانیوں کا مشاہدہ کر لینے کے بعد حالتِ اطمینان و سکون میں آجاتا ہے اور اس کا ایمان اللہ کی ذات پر مزید بڑھ جاتا ہے۔

(۵) قلبِ خائف: قلب خائف وہ ہے جو ہر وقت خوف و اضطراب کی کیفیت میں رہتا ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا:

قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ۔ (النازعات، ۷۹: ۸)

"اس دن (لوگوں کے) دل خوف و اضطراب سے دھڑکتے ہوں گے۔"

(۶) القلب المرعوب: جو دل رعب و دبدبہ میں آجائے، اسے قلبِ مرعوب کہتے ہیں۔ اس کے لیے فرمایا:

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ (آل عمران، ۳: ۱۵۱)

ہم عنقریب کافروں کے دل میں تمہارا رعب ڈال دیں گے۔

(۷) القلب الحی: قلبِ حی سے مراد زندہ دل ہے۔ فرمایا:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ۔ (ق، ۵۰: ۳۷)

بے شک ان کھنڈرات اور نشانیوں میں اس کے لیے نصیحت اور انتباہ ہے، جس کا دل زندہ ہو گیا۔ گویا جس کا دل خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائے، اسے قلبِ حی کہتے ہیں۔

(۸) القلب المیت: قلبِ میت کا ذکر کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے فرمایا:

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔ (الاعراف، ۷: ۱۷۹)

”وہ دل (و دماغ) رکھتے ہیں (مگر) وہ ان سے (حق کو) سمجھ نہیں سکتے اور وہ آنکھیں رکھتے ہیں (مگر) وہ ان سے (حق کو) دیکھ نہیں سکتے اور وہ کان (بھی) رکھتے ہیں (مگر) وہ ان سے (حق کو) سن نہیں سکتے، وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ (ان سے بھی) زیادہ گمراہ، وہی لوگ ہی غافل ہیں۔“

(۹) القلب اللیّن: قلبِ لیّن سے مراد نرمی والا دل ہے۔ فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ۔ (آل عمران، ۳: ۱۵۹)

محبوب یہ آپ کے قلبِ اطہر کی وہ نرمی ہے کہ آپ ان کے لیے پیکرِ عفو و درگزر اور سخی و لجپال ہیں۔ جو آتا ہے آپ ﷺ کی بارگاہ سے اپنی مرادوں کی جھولی بھر کر لے جاتا ہے۔

(۱۰) قلب عجل: ارشاد فرمایا:

قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ۔ (البقرۃ، ۲: ۹۳)

یہ دل عجلت میں نافرمانی کرنے والے کفار کے دل ہیں جنھوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔

(۱۱) القلب الاعمیٰ: اندھے دل کو قلب الاعمیٰ کہتے ہیں۔ فرمایا:

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ۔ (الحج، ۲۲: ۴۶)

”تو کیا انہوں نے زمین میں سیر و سیاحت نہیں کی کہ (شاید ان کھنڈرات کو دیکھ کر) ان کے دل (ایسے) ہو جاتے جن سے وہ سمجھ سکتے یا کان (ایسے) ہو جاتے

جن سے وہ (حق کی بات) سن سکتے، تو حقیقت یہ ہے کہ (ایسوں کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔"

قلب پر غلبہ کے لیے نفس اور روح کے مابین جنگ

اللہ رب العزت نے انسان کے باطن میں دل کے ساتھ نفس اور روح کو بھی رکھا ہے۔ دل درمیان میں ہے اور اس کے ایک طرف نفس اور دوسری طرف روح ہے۔ یہ دونوں اپنی اپنی حیثیت میں اس دل پر اثر انداز ہونے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ نفس کے بارے میں ارشاد فرمایا:

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا۔ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا۔ (الشمس، ۹۱: ۸،۹)

یعنی ہم نے نفس میں فسق و فجور کی طاقت بھی رکھی ہے اور تقویٰ و طہارت کو سمجھنے کی طاقت بھی رکھی ہے مگر کامیاب وہ ہی ہوتا ہے جس نے نفس کو پاک صاف کر دیا۔ اس لیے کہ نفس برائی اور بے حیائی کی طرف ابھارتا ہے اور برائی کی طرف راغب کرتا ہے۔

روح کے بارے میں فرمایا:

قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي۔ (الاسراء، ۱۷: ۸۵)

فرما دیجیے: روح میرے رب کے امر سے ہے۔ یعنی روح کا معاملہ میرے رب کے ساتھ ہے۔ یہ وہاں سے آتی ہے۔

انسان کی تخلیق مادہ اور روح دونوں کے امتزاج کے ساتھ ہے۔ اللہ رب العزت نے انسان کی تخلیق کے حوالے سے فرمایا:

إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ۔ (الحجر، ۱۵: ۲۸)

" فرمایا کہ میں سن رسیدہ (اور) سیاہ بودار، بجنے والے گارے سے ایک بشری پیکر پیدا کرنے والا ہوں۔"

اس آیت میں اللہ رب العزت نے انسان کے تشکیلی عناصر کا ذکر کیا ہے۔ ان تشکیلی عناصر کے باعث اس میں تکبر، شہوت و خود پسندی، دنیوی رغبت و میلان، دنیا کی چاہت و محبت، دنیا کا حرص و طمع، لالچ، بغض و حسد، غیبت، جھوٹ، غضب، دشمنی و عداوت اور کینہ پروری گویا ہر برائی اس میں پائی جاتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی نفس کو ان رذائلِ خبیثہ سے چھٹکارا کیسے ملے گا؟ اور یہ نفسِ انسانی کیسے نکھرے گا اور اس میں اجلا پن کیسے آئے گا؟ اس امر کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیکر بشری بنا لینے کے بعد:

وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي۔ (الحجر، ۱۵: ۲۹)

اپنی نورانی روح اس کے جسد میں پھونک دی۔ اب اس روح کے باعث اس میں اوصافِ حمیدہ اور مثبت رجحانات جنم لیتے ہیں۔ جبکہ تشکیلی عناصر کے باعث اس میں رذائلِ خبیثہ اور منفی رجحانات جنم لیتے ہیں۔

نفس اور روح دو پارٹیوں کا نام ہے۔ نفس کی پارٹی کا نام شیطان ہے اور روح کی پارٹی کا نام رحمٰن ہے۔ ان کے درمیان کشمکش شروع ہے جو جنگ کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ جس بندے کے نفس پر روح غالب آگئی، وہ نورانی اور روحانی ہو جائے گا اور جس کا نفس اس کی روح پر غالب آگیا، وہ بندہ نفسانی اور شیطانی ہو جائے گا۔

روح اور نفس کے اس مقابلہ میں اللہ رب العزت نے دونوں کو لیول پلینگ فیلڈ دی ہے لیکن وہ اس میں دھاندلی نہیں ہونے دیتا۔ اگر نفس شیطان کی مدد سے شتونگڑوں کو لے آئے گا تو روح کے مددگار اولیاءِ رحمٰن بھی موجود ہیں۔ شیطان اپنے نمائندوں کو خریدنے کے لیے ان کو دنیا دکھاتا ہے، کسی کو شہوت پرستی کی طرف راغب کرتا ہے، کسی کو محلات اور سواریوں کی لالچ دیتا ہے اور جو جو اس سے سودا خریدتا ہے، وہ اس کا ساتھی اور سپورٹر ہوتا چلا جاتا ہے۔ دوسری طرف رحمٰن والے روح کے ساتھی ہیں، جن کے دل زندہ ہو چکے ہیں، ان کی مجلس میں بیٹھنے والوں کے دل بھی ان کے فیض سے زندہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یوں روح کے اولیاء بڑھتے بڑھتے کثرت اختیار کر لیتے ہیں۔

جب روح اور نفس کے ووٹرز اور سپورٹرز کی اس جنگ میں روح کامیاب ہو جاتی ہے تو اپنے ساتھیوں کو اپنے دائرے کے اندر بند کر لیتی ہے اور اگر کوئی بھٹک کر شیطان اور نفس کی طرف جانے بھی لگے تو پکڑ کر روک لیتی ہے اور راہِ راست پر چلاتی ہے۔ روح کے ساتھی اولیاء ہوتے ہیں جو دوسروں کو اپنی چوکھٹ پر بٹھاتے ہیں اور ان کی تربیت بھی کرتے ہیں اور راہِ راست پر بھی چلاتے ہیں۔ حضور قدوۃ الاولیاء فرماتے ہیں کہ وہ پیر نہیں ہوتا، جسے اپنے مریدین کی خبر نہ ہو اور ان کی فکر نہ ہو۔

حضرت پیر مہر علی شاہؒ کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ حضرت میں آپ کا مرید ہونا چاہتا ہوں۔ آپ نے شرائط بتائیں تو کہا سب کچھ چھوڑ دوں گا مگر شراب نہیں چھوڑی جا سکتی۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی بات نہیں مگر اتنا تو کر سکتے ہو کہ میرے سامنے نہیں پیو گے؟ اس نے کہا کہ ایسی جرأت میں کیسے کر سکتا ہوں۔ وعدہ کیا کہ آپ کے سامنے نہیں پیوں گا۔ وہ شخص بیعت کر کے چلا گیا۔ جب گولڑہ شریف سے دور نکل آیا تو شراب کی بوتل کھولی، جونہی اس نے شراب کی بوتل منہ سے لگائی تو کیا دیکھتا ہے کہ سامنے پیر مہر علی شاہ کھڑے ہیں۔ فوراً بوتل پھینک کر آپ کی طرف دوڑا تو آپ غائب ہو چکے تھے۔ اس نے اسے اپنا وہم سمجھا۔

اس کے بعد اس نے دوسری بوتل کھولی، جب اسے لبوں کے قریب لایا تو دیکھا کہ پیر صاحب پھر سامنے کھڑے ہیں۔ پھر ان کی طرف دوڑا تو آپ غائب ہو گئے حتی کہ تیسری دفعہ جب واقعہ ہوا تو

شراب کی بوتل توڑی اور آپ کی بارگاہ میں چلا گیا اور عرض کیا کہ حضرت اگر اجازت دی تھی تو پیچھا بھی چھوڑ دیتے۔ فرمایا: وہ پیر ہی کیا جو مرید کا پیچھا چھوڑ دے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ تحریک منہاج القرآن کے ایک رفیق نے مجھے سنایا۔ وہ کہتا ہے کہ جوانی میں جب مجھے منہاج القرآن سے وابستہ ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا اور مرکز کی طرف سے دیے گئے اوراد و وظائف پر بھی حسبِ استطاعت عمل کرتا تھا لیکن ابھی میں نفس اور شیطان کے حملوں کی زد میں تھا کہ اس دوران میں ایک دفعہ ایک خاتون نے مجھے برائی کی طرف بلایا۔ میں نے اس خاتون کی دعوت قبول کر لی اور وقتِ مقررہ پر اس کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ میں نے راستے میں اپنے سامنے شیخ الاسلام کو کھڑے پایا۔ میں نے راستہ تبدیل کیا اور دوسری طرف سے جانے لگا تو وہاں بھی شیخ الاسلام کو کھڑا پایا۔ میں نے تیسرے راستے سے اس گلی میں داخل ہونا چاہا تو مجھے ایک زوردار تھپڑ لگا اور آواز آئی کہ جب روکا ہے تو پھر کیوں آتے ہو۔

مراد یہ ہے کہ جب روح جنگ جیت جاتی ہے تو اس کے سپورٹرز بھی مدد و معاون بن جاتے ہیں۔

قلب پر روح کے غلبہ کے اثرات اور انعام

جب روح کی فوج جیت جاتی ہے اور جسم کی پارلیمنٹ میں براجمان ہو جاتی ہے تو اللہ رب العزت دل کو بھی روح کے تابع کر دیتا ہے۔ اور پھر دل کے روح کے تابع ہونے کے ساتھ ہی جسم کے تمام اعضاء اس دل کے تابع ہو جاتے ہیں۔ جب دل پر روح کا مکمل غلبہ ہو جاتا ہے اور جسم کے تمام اعضاء اس قلبِ سلیم کے تابع ہو جاتے ہیں تو اب اس بندے کو یہ مقام ملتا ہے جس کے بارے میں حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا وَإِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ وَلَئِنْ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْءٍ أَنَا فَاعِلُهُ تَرَدُّدِي عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَأَنَا أَكْرَهُ مَسَاءَتَهُ۔ (بخاري، الصحيح، باب التواضع، ۵: ۲۳۸۴، الرقم: ۶۱۳۷)

جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی اسے میری طرف سے اعلان جنگ ہے اور میرا بندہ جن جن عبادتوں سے میرا قرب حاصل کرتا ہے اور کوئی عبادت مجھ کو اس سے زیادہ پسند نہیں ہے جو میں نے اس پر فرض کی ہے (یعنی فرائض مجھ کو بہت

پسند ہیں جیسے نماز ، روزہ، حج ، زکوٰۃ) اور میرا بندہ فرض ادا کرنے کے بعد نفل عبادتیں کرکے مجھ سے اتنا نزدیک ہوجاتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں۔ پھر جب میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے ، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں اگر وہ کسی دشمن یا شیطان سے میری پناہ مانگتا ہے تو میں اسے محفوظ رکھتا ہوں اور میں جو کام کرنا چاہتا ہوں اس میں مجھے اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا کہ مجھے اپنے مومن بندے کی جان نکالنے میں ہوتا ہے۔ وہ تو موت کو بوجہ تکلیف جسمانی کے پسند نہیں کرتا اور مجھ کو بھی اسے تکلیف دینا برا لگتا ہے۔

گویا اللہ رب العزت فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ نفلی عبادت، اطاعت و فرمانبرداری اور خدمتِ انسانیت کے ذریعے میرے قریب ہونا شروع کر دیتا ہے اور جب میں اس کے دل کی کیفیت دیکھتا ہوں تو اسے قلب سلیم عطا کرکے اپنا محبوب بنالیتا ہوں۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

اتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللهِ (السنن، الترمذي، باب ومن سورة الحجر، ۱۰: ۲۹۸، الرقم: ۳۵۲۷)

اس حدیث قدسی کا آغاز من عادی ولیا سے کیوں ہوا؟ اس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ بے شک بندہ فرائض و واجبات، نوافل، عبادات، طاعات بجا لاتا رہا لیکن اگر اس کے دل میں میرے کسی ولی کی عداوت ہو گی تو نہ فرائض کام آئیں گے نہ نوافل۔ اگر دل میں میرے ولی کی محبت پائی گئی تو فرائض بھی قبول اور نوافل بھی قبول ہوں گے۔ ان عبادات کی قبولیت کے لیے اصحاب کہف کے کتے کی طرح کسی کامل ولی کی چوکھٹ پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ اگر مالک کو بیٹھنے کا انداز پسند آگیا تو نوافل کی کمی بھی آڑے نہیں آئے گی بلکہ وہ شرفِ قبولیت عطا فرماتے ہوئے اپنا محبوب بنالے گا۔

دل کو زندہ کیسے کیا جائے؟

☆ حضرت ابن عطا السکندری ''الحکم العطایا'' میں نقل کرتے ہیں کہ ان سے پوچھا گیا کہ دل کو زندہ کیسے کریں؟ یہ دل مولا کو کب پہچانتا ہے؟ آپ نے فرمایا: اے بندے! اگر تو سرفراز ہونا چاہتا ہے اور دل کو اللہ کی بارگاہ میں قربت کے مقام پر رکھنا چاہتا ہے تو:

ادْفِنْ وُجُودَكَ فِي أَرْضِ الْخُمُولِ فَمَا نَبَتَ مِمَّا لَمْ يُدْفَنْ لَمْ يَتِمَّ نِتَاجُهُ. (فیض القدیر، ۱: ۱۸۸)

اپنے وجود، اپنے شعور، خیال، تصور، چاہت، ارادے، جاہ و منصب کے احساس اور اپنے ہونے کے احساس کو گمنامی کی زمین میں دفن کر دو۔ کیونکہ جب تک کسی بیج کو زمین میں دفن نہ کیا جائے، تب تک نہ اس بیج سے پھل اگتا ہے نہ پھول۔ اس لیے اے بندے پہلے تو اپنے وجود کے بیج کو گمنامی کی زمین میں فن کر دے۔ بعد ازاں جب وہ گمنامی کی زمین سے ظاہر ہو گا تو تجھے نامور کر دے گا۔ لہٰذا دل کو دنیا کی شہوات، طلب، رغبت اور میلانات سے بچانے کے لیے گمنام کرنا پڑتا ہے۔ جیسے سیدہ مریم علیہا السلام نے فرمایا تھا:

وَكُنْتُ نَسْيًا مَنْسِيًّا۔ (مریم، ۱۹: ۲۳)

پس کچھ بننے کے لیے پہلے خود کو مٹانا پڑتا ہے۔ کبھی خلوت نشین ہونا پڑتا ہے، کبھی اپنا احساس بھی مٹانا پڑتا ہے، کبھی کچھ لینے کے لیے اپنا عنوان بھی ہٹانا پڑتا ہے اور پہچان بھی ختم کرنی پڑتی ہے۔ اِدھر سے بندہ مٹتا ہے تو اُدھر اسے خدا زندہ و جاوید بنا دیتا ہے۔

☆ حضرت امام شافعی سے پوچھا گیا کہ حضرت آپ کی چاہت کیا ہے؟ فرمایا میری تو خواہش یہ ہے:

یا بنی لوددت أن الخلق کلهم تعلموا یرید کتبه ولا ینسب إلی منه شیء وددت أن کل علم أعلمه یعلمه الناس أوجر علیه ولا یحمدونی۔ (حلیۃ الاولیاء، ۹: ۱۱۹)

میں یہ چاہتا ہوں کہ میری کتابوں سے ساری مخلوق علم لیتی رہے لیکن یہ نہ کہے کہ یہ کس نے کہا۔ چاہتا ہوں کہ جو علم اللہ نے مجھے دیا ہے، وہ سارے کا سارا علم لوگ مجھ سے لیں مگر میری تعریف نہ کریں۔ تاکہ اللہ کی بارگاہ میں علم لے کر بھی گمنام رہوں اور علم دے کر بھی گمنام رہوں۔

یہی وہ عمل ہے جو ہمارے نفس کو اس کے مقام پر رکھتا ہے اور قلب کو سلیم و منیب بناتا ہے اور زندہ کرتا ہے۔ جس کا دل زندہ ہو گیا۔ وہ مقصدِ حیات پا گیا۔

؎ دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

لہٰذا ضروری ہے کہ ہم تصویرِ محبوب کو اپنے دل میں جمالیں اور اسی کی چاہت کو دل میں بسالیں۔ اگر دنیا کی چاہت دستک بھی دے تو کہیں کہ یہاں تو کوئی اور بستا ہے، یہاں تیرا کام ہی نہیں اور نہ تیری ضرورت و حاجت ہے۔

تصورِ فنا و بقا اور حیاتِ انسانی

پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری
(صدر منہاج القرآن انٹرنیشنل)

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ۔ (الرحمن، ۵۵: ۲۶، ۲۷)

"ہر کوئی جو بھی زمین پر ہے فنا ہو جانے والا ہے۔اور آپ کے رب ہی کی ذات باقی رہے گی جو صاحبِ عظمت و جلال اور صاحبِ انعام و اکرام ہے۔"

"فنا" عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ختم ہونا ہے۔ کسی شے کا زوال پذیر ہو جانا یا کسی شے کی نفی ہو جانا یا کسی شے کا غائب ہو جانا، "فنا" کے مفہوم میں داخل ہے۔ "فنا" کا تصور اہلِ تصوف کے ہاں زیادہ پایا جاتا ہے۔ تصوف کے علاوہ بھی فنا کے معانی و مطالب پائے جاتے ہیں مگر تصورِ فنا کی سب سے بہتر تعریف کتبِ تصوف میں بیان کی گئی ہے۔

صوفیا کے ہاں فنا سے مراد در حقیقت ایک تبدیلی کا رونما ہونا ہے۔ قربتِ حق کے حصول میں جو نفسیاتی، اجتماعی، انفرادی، شخصی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، صوفیا ان تبدیلیوں کو فنا کا نام دیتے ہیں۔ جب راہِ حق کا متلاشی سالک اپنے روحانی سفر پر گامزن ہوتا ہے تو اس روحانی سفر میں فنا کا ایک موثر کردار ہے اور بعض اوقات منزلِ مقصود تک پہنچنے اور سفر کی تکمیل کے لیے فنا نا گزیر ہے۔

تصورِ فنا؛ انا پرستی، ذات کی نفی اور اپنی خودی سے ماوراء ہونے کا نام ہے۔ وہ خودی جس کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ خودی تیری مسلمان کیوں نہیں ہے۔ اسی خودی سے ماوراء ہو جانا فنا ہے۔ انا پرستی وہ چیز ہے کہ جس سے ہر کوئی مزین نظر آتا ہے۔ دنیا میں انسان جتنے برے کام کرتا ہے اس

میں اس کی انا کا عمل شامل ہوتا ہے۔ انسان کو اللہ کی طرف رجوع کرنے اور کسی ظلم پر معافی مانگنے سے اگر کوئی شے روکتی ہے تو وہ اس کی انا ہے۔ یہ انا ہی ہے جو اپنی بداعمالیوں پر بھی بندے کو شرمندہ نہیں ہونے دیتی۔ اس انا پرستی کو چھوڑ دینا اور اپنی خودی سے بالاتر ہو جانا، صوفیاء کے ہاں فنا سے عبارت ہے۔

فنا کی جہات

حضرت شیخ ابن العربیؒ جو صوفیاء کے ہاں تصوف کی ابحاث میں حجت مانے جاتے ہیں، آپ نے کثرت کے ساتھ فنا کے موضوع پر ابحاث قلمبند کی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ فنا محض وجود کا مٹ جانا نہیں ہے بلکہ یہ ایک تبدیلی کا عمل ہے جس میں بندہ اپنے نفس کی زنجیروں کو توڑ کر خدا کے اوصاف سے مزین ہو جاتا ہے۔ پھر اس میں شعوری سطح کی ایک گہری تبدیلی رونما ہوتی ہے جس میں سالک انفصالِ نفس کی حالت سے اتصالِ حق کی حالت کی طرف سفر کرتا ہے اور یہی سفر حقیقت کی راہ کے متلاشیوں کی حقیقت ہے۔ فنا ایک کثیر الجہتی تصور کا نام ہے جس میں وجودی اور تجرباتی دونوں جہات شامل ہیں:

۱۔ وجودی فنا سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی ذات، اپنے نفس، انا پرستی، ذاتی رجحانات و میلانات اور اپنی من پسند عادات واطوار کو ختم کر دیتا ہے۔ اس وجودی فنا کے حصول کا ذریعہ تزکیۂ نفس ہے۔

۲۔ تجرباتی فنا سے مراد سالک کا خدا کے ذکر میں یوں مستغرق ہو جانا ہے کہ پھر اسے کسی اور شے کا تجربہ باقی نہ رہے۔ انسان تجربہ اپنے حواس سے حاصل کرتا ہے اور حواس سے حاصل ہونے والا تجربہ اس کی یادداشت بن جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے تمام حواس کو صرف اللہ کے ذکر و فکر اور اللہ سے وابستہ امور کے لیے استعمال کرے اور جو کچھ اس کے حواس کے ذریعے ذہن میں داخل ہو رہا ہے، وہ یادِ خدا کے سوا کچھ نہ ہو۔ یہ تجرباتی فنا اپنے حواس کو خدا کی نوکری یعنی خدمتِ دین میں لگا دینے کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔

فنا کا حصول عشق سے ہی ممکن ہے

حضرت شیخ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ فنا کے سفر میں جو چیز سب سے زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوتی ہے وہ عشق ہے کیونکہ عشق فوراً جھاڑیاں جلا دیتا ہے۔ عشق repair (مرمت) نہیں کرتا بلکہ reconstruct (تعمیرِ نو) کرتا ہے یعنی عشق پہلے سے موجود چیز کی خرابی کو ٹھیک نہیں کرتا بلکہ پہلے سے موجود چیز کے وجود کو جلا دیتا ہے اور پھر وہاں نئے سرے سے تعمیر کرتا ہے۔ اسی کو فنا کے بعد بقا کہتے ہیں۔ لہٰذا جسے عشق نہ ہوا، اس نے فنا کا مزہ نہ چکھا۔

فقط آسان طریقہ سے اعمال صالحہ کی انجام دہی کہ دنیا بھی چلتی رہے آخرت بھی چلتی رہے، اس راستے سے فنا نصیب نہیں ہوتی بلکہ فنا تو یک دم کیے جانے والا عمل ہے کہ انسان یک دم عشق میں یوں مبتلا ہوتا ہے کہ پھر وہ بھوک و پیاس سے آزاد ہو جاتا ہے، اسے ایسا روگ لگ جاتا ہے کہ صبح و شام یادِ خدا میں مست الست رہتا ہے۔ اسے کسی شے کا خیال نہیں سوجھتا، کوئی اور صورت نظر نہیں آتی اور نہ ہی کوئی اور دھیان باقی رہتا ہے، بس اس کا عشق بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ عشق کی وہ چنگاری بھانبڑ بن جاتی ہے اور تمام حیات کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور جو بچتا ہے، وہ صرف باقی کا خیال بچتا ہے، باقی کی ذات بچتی ہے اور باقی کے تصورات بچتے ہیں۔

اس لیے شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ فنا کے لیے سب سے موثر نسخہ عشق ہے اور فنا کے سفر کے لیے سب سے موثر راستہ اللہ والے کی سنگت ہے۔

تصورِ فنا قرآن مجید کی روشنی میں

۱۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً۔ (البقرہ، ۲: ۲۰۸)

”اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔“

اس آیت کریمہ کا مفہوم ہم اس دعا کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں:

اللھم من احییتہ منا فاحیینا علی الاسلام و من توفیتہ منا فتوفہ علی الایمان۔

اے اللہ ہم میں سے تو نے جس کو زندہ رکھنا ہے، اسے اسلام پر زندہ رکھ اور ہم میں سے جسے موت دینی ہے تو اسے ایمان پر موت دے۔

یعنی موت ایمان کی حالت میں دے اور حیات اسلام کی حالت میں دے۔ معلوم ہوا کہ اسلام جس شے کا نام ہے، وہ حیات کی علامت ہے۔ ایمان دل کی حالت ہے اور اسلام انسان کی ظاہری حالت ہے۔ ایمان کی زمین میں اعمال کی عمارت کا نام اسلام ہے جہاں اللہ تعالیٰ ہمیں مکمل داخل ہو جانے کا حکم ارشاد فرما رہا ہے کہ ایمان کی زمین پر اعمال کی جو عمارت (اسلام) کھڑی ہے، اس میں کامل طور پر داخل ہو جاؤ۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ فنا کا سفر طے کرتے ہوئے بقا کی عمارت میں داخل ہو جاؤ۔

۲۔ ایک اور مقام پر فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (آل عمران، ۳: ۱۰۲)

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرا کرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہاری موت صرف اسی حال پر آئے کہ تم مسلمان ہو۔“

صوفیاء اس آیت مبارکہ میں اسلام اور مسلمان سے مراد ''باقی'' کو لیتے ہیں کہ تمہاری موت اس حال میں آئے کہ تم فنا کے راستے کے مسافر بن چکے ہو اور فنا کی وادی کو ترک کر چکے ہو۔ اللہ رب العزت نے اس آیت کا آغاز یا ایھاالذین امنوا سے فرمایا یعنی سفرِ فنا کے لیے انفرادی طور پر نہیں بلایا بلکہ اجتماعی طور پر بلایا جارہا ہے کہ اے ایمان والو فنا کے راستے کے ذریعے بقا کی طرف سفر کرو۔

۳۔ ایک اور مقام پر فنا اور بقا کے تصور کو بیان کرتے ہوئے قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (الانعام،۶: ۱۲۲)

'' بھلا وہ شخص جو مردہ (یعنی ایمان سے محروم) تھا پھر ہم نے اسے (ہدایت کی بدولت) زندہ کیا اور ہم نے اس کے لیے (ایمان و معرفت کا) نور پیدا فرما دیا (اب) وہ اس کے ذریعے (بقیہ) لوگوں میں (بھی روشنی پھیلانے کے لیے) چلتا ہے اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہو کہ (وہ جہالت اور گمراہی کے) اندھیروں میں (اس طرح گھرا) پڑا ہے کہ اس سے نکل ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح کافروں کے لیے ان کے وہ اعمال (ان کی نظروں میں) خوشنما دکھائے جاتے ہیں جو وہ انجام دیتے رہتے ہیں۔''

اس آیت مبارکہ نے ایک اور عقدہ حل فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ نے فنا کے بعد بقا کا تذکرہ کیا کہ پہلے مردہ تھا پھر اس نے زندہ فرمادیا۔ پھر جس کو بقا کے ساتھ زندہ کیا تو اس کے لیے ایک نور پیدا فرمادیا جس نور کے ساتھ وہ چلتا پھرتا ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ جو لوگ اس کے ساتھ باقی ہو جاتے ہیں۔ یعنی جو لوگ اپنی انا، اپنے وجود، تجربے، احساس اور اپنی خواہشاتِ نفسانی کو فنا کر دیتے ہیں اور خدا کی خاطر اس کے ساتھ باقی ہو جاتے ہیں تو خدا ان کو دنیا میں ہی وہ نور عطا کر دیتا ہے کہ جب وہ چلتے پھرتے ہیں تو وہ خود بھی نورانی نظر آتے ہیں، جو ان کی صحبت میں بیٹھتا ہے اس کو بھی نور والا کر دیتے ہیں، جو ان کی باتیں سنتا ہے، وہ اپنی سماعتوں کے ذریعے نور سمیٹ لیتا ہے، جو اپنے دلوں کو ان کی طرف متوجہ کرتا ہے، وہ دلوں میں نور حاصل کر لیتا ہے اور جو ان کے چہروں کو تکتا ہے، وہ اپنی نگاہوں میں نور سمیٹ لیتا ہے۔

۴۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔

'' اور تمہارے لیے قصاص (یعنی خون کا بدلہ لینے) میں ہی زندگی (کی ضمانت) ہے اے عقلمند لوگو! تاکہ تم (خونریزی اور بربادی سے) بچو۔'' (البقرہ،۲: ۱۷۹)

یعنی تمہاری فنا میں ہی حیات ہے۔ اس آیت مبارکہ کی تفسیر بھی صوفیاء کرام اسی انداز میں کرتے ہیں کہ فنا کے بعد بقا ملتی ہے۔

۵۔ تصورِ فنا تصورِ بقا کی ضد ہے۔ بقا قائم رہنے کو کہتے ہیں یعنی وہ شے جس کو دوام نصیب ہو جائے اس کو باقی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بقا کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

وَاللّٰہُ خَیۡرٌ وَّاَبۡقٰی۔ (طٰہٰ، ۲۰: ۷۳)

''اور اللہ ہی بہتر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔''

فنا اور بقا سننے اور سمجھنے میں دو متضاد تصورات ہیں اس لیے کہ ایک موت کی علامت ہے اور دوسرا زندگی کی علامت ہے۔۔۔ ایک شے ختم ہو جانے سے عبارت ہے اور ایک شے زندہ ہو جانے سے عبارت ہے لیکن یہ ایک دوسرے کی تکمیل کی علامت ہیں۔ فنا سے بقا الگ نہیں ہو سکتی اور بقا سے فنا الگ نہیں ہو سکتی۔ فنا ہے تو بقا ہو گی اور اگر بقا ہے تو لازم ہے کہ پہلے فنا ہوئی ہو۔ گویا یہ دونوں تصورات ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں۔

فنا اور بقاء کی اقسام

۱۔ فنا اور بقا کی ایک قسم یہ ہے کہ ایک شے پہلے موجود تھی، پھر وہ ختم کر دی گئی، فنا کر دی گئی، اس کے بعد اسے بقا نہیں ملے گی۔ جیسے عالمِ ناسوت ہے یعنی یہ دنیا بنائی گئی اور جب اسے فنا کر دیا جائے گا تو دوبارہ نہیں بنایا جائے گا۔

۲۔ فنا اور بقا کی دوسری قسم یہ ہے کہ جو پہلے وجود میں نہ تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے وجود دے دیا اور اس کے بعد وہ ہمیشہ رہے گی۔ یعنی اس کو دائمی بقا نصیب ہوئی۔ جیسے جنت و دوزخ۔ یہ پہلے نہ تھیں، پھر اللہ تعالیٰ نے بنا دیا، اب یہ ہمیشہ رہیں گی۔

۳۔ بقا کی تیسری قسم یہ ہے کہ جو پہلے بھی تھی، آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ وہ اللہ رب العزت کی ذات ہے۔

۴۔ فنا و بقا کی چوتھی قسم کے متعلق صوفیا فرماتے ہیں کہ جب جہالت فنا ہو جائے تو علم کو بقا ملتی ہے۔۔۔ جب معصیت فنا ہوتی ہے تو طاعت باقی ہو جاتی ہے۔۔۔ جب غفلت فنا ہو جاتی ہے تو حضوری باقی ہو جاتی ہے۔۔۔ اور جب دنیا فنا کر دی جاتی ہے تو آخرت باقی ہو جاتی ہے۔ گویا صوفیا کے ہاں فنا اور بقا کے تصور میں ہر وہ شے جو اس فانی جسم اور ناسوتی دنیا سے جڑی ہوئی ہے، اسے فنا کر دیا جاتا ہے اور ہر وہ شے جو اس باقی سے جڑی ہوئی ہے، اسے بقا دی جاتی ہے، اسے دوام نصیب ہو جاتا ہے۔

☆ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ فنا اور بقا کے تصور کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فنا سے مراد بندے کا اپنی بندگی کو دیکھنے سے فانی ہو جانا ہے اور بقا سے مراد بندے کا مشاہدۂ حق میں باقی رہنا ہے۔ یعنی مشاہدۂ حق کو دوام نصیب ہو جائے اور اپنے اعمالِ صالحہ کی انجام دہی پر جانے والی نگاہ فانی ہو جاتی ہے۔

☆ مولانا رومؒ فنا اور بقا سے متعلق فرماتے ہیں کہ فنا کی باتیں کرنے میں وہ لوگ کامل ہیں جو باقی ہیں۔ یعنی وہ لوگ فنا سے متعلق بہتر بتا سکتے ہیں جو باقی ہو چکے ہیں اور بقا کی راہ میں سیکھنے سمجھنے میں زندگی گزارتے ہیں۔

☆ سیدنا غوث الاعظمؓ فرماتے ہیں کہ فنا یہ ہے کہ ولی تجلی خداوندی کا مشاہدہ کر کے اپنی جان اور اپنی ذات کو فنا کر دیتے ہیں۔ یعنی ولی خدا کے اشارہ سے فنا کر دیا جاتا ہے اور اس کی تجلی سے باقی بنا دیا جاتا ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ فنا اور بقا کے درمیان ایک لمحے یا اس سے بھی کم کا فرق ہوتا ہے۔ جونہی فنا نصیب ہوئی، اسی وقت خدا نے باقی کر دیا کیونکہ جب باطن میں کچھ نہیں رہتا تو وہاں صرف خدا ہوتا ہے۔ لہٰذا جب بندہ سب کچھ ختم کر کے فنا حاصل کر لیتا ہے تو پھر خدا خود نزول فرماتا ہے اور اس کو بقا عطا کرتا ہے۔ یہ موت و حیات کی طرح ہے کہ جونہی انسان دنیا سے رخصت ہوا، اسی لمحے اس فانی دنیا سے نکل کر باقی دنیا میں چلا گیا۔ جس طرح ایک لمحہ اس کی روح کے نکلنے اور اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہونے میں لگتا ہے، اسی طرح فنا کی وادی سے نکل کر بقا کی وادی میں منتقل ہونے میں بھی ایک لمحہ سے بھی کم عرصہ لگتا ہے۔

☆ اللہ رب العزت نے فنا سے بقا کی طرف دعوت ان الفاظ میں دی، ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ۔ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ۔

”اے اطمینان پا جانے والے نفس۔ تو اپنے رب کی طرف اس حال میں لوٹ آ کہ تو اس کی رضا کا طالب بھی ہو اور اس کی رضا کا مطلوب بھی (گویا اس کی رضا تیری مطلوب ہو اور تیری رضا اس کی مطلوب)۔ پس تو میرے (کامل) بندوں میں شامل ہو جا۔ اور میری جنتِ (قربت و دیدار) میں داخل ہو جا۔“ (الفجر، ۸۹: ۲۷۔۳۰)

یہ وہ دعوت ہے جو فنا کی وادی سے بقا کی وادی کی طرف دی جاتی ہے۔ حدیث قدسی میں ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

يَقُولُ اللهُ تَعَالَى: أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي، فَإِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي، وَإِنْ ذَكَرَنِي فِي مَلَإٍ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَإٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ، وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ بِشِبْرٍ تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعًا، وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ بَاعًا، وَإِنْ أَتَانِي يَمْشِي، أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً۔ (اخرجہ البخاری فی الصحیح، کتاب: التوحید، باب: قول اللہ تعالی: ویحذرکم اللہ نفسہ، ۶: ۲۶۹۴، الرقم: ۶۹۷۰)

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بندہ میرے متعلق جیسا خیال رکھتا ہے میں اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں۔ جب وہ میرا ذکر کرتا ہے میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ اپنے دل میں میرا ذکر (یعنی ذکر خفی) کرے تو میں بھی (اپنی شان کے لائق) اپنے دل میں اس کا ذکر کرتا ہوں، اور اگر وہ جماعت میں میرا ذکر (یعنی ذکر جلی) کرے تو میں اس کی جماعت سے بہتر جماعت (یعنی فرشتوں) میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اگر وہ ایک بالشت میرے نزدیک آئے تو میں ایک بازو کے برابر اس کے نزدیک ہو جاتا ہوں۔ اگر وہ ایک بازو کے برابر میرے نزدیک آئے تو میں دو بازوؤں کے برابر اس کے نزدیک ہو جاتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چل کر آئے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔“

گویا جب بندہ فنا کے جذبے کے ساتھ میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف بقا کا پیالہ لے کر چار ہاتھ بڑھتا ہوں اور اگر وہ میری طرف ایک قدم بڑھتا ہے تو میں بقا کے تصور اور پیغام کے ساتھ اس کی طرف تیزی سے بڑھتا ہوں۔

تصور فنا و بقا کے مراحل

فنا و بقا کے سفر میں چار مراحل آتے ہیں:

(۱) خود آگہی

فنا و بقا کے سفر کا پہلا مرحلہ خود آگہی کا ہے۔ اس مرحلہ میں انسان سب سے پہلے اپنے نفس کو پہچانتا ہے اور اپنے اندر پائی جانے والی خامیوں اور خرابیوں کو جاننے اور ان کا دائرہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے نفس کے حدود و قیود اور کمزوریوں کو سمجھتا ہے حتیٰ کہ اپنی کم فہمی اور نالائقی کو سمجھتا ہے اور اس میں غور و خوض کرنا شروع کرتا ہے۔ یہ فنا کی راہ کا مسافر ہونے کی پہلی علامت اور مرحلہ ہے۔

(۲) تزکیۂ نفس

تصور فنا و بقا کے راستے میں دوسرا مرحلہ تزکیہ نفس کا آتا ہے۔ اس مرحلہ میں فنا کی راہ کا مسافر اور سالک ریاضت و مجاہدہ کے ذریعے تزکیہ و تصفیہ قلب کرتا ہے۔ وہ نماز، روزہ، حج، اعتکاف اور نفلی عبادات، اعمال صالحہ کی انجام دہی اور اخلاق حسنہ کو کاملاً اپناتا ہے دوسروں کی غلطیوں سے درگزر کرتا اور معاف کرنے کا وطیرہ اپناتا ہے۔ یہ مرحلہ اپنی نفسانی خواہشات کو ترک کرنا، اپنے اوپر جبر کرنا اور اس طرح کی بہت ساری مشقوں پر مشتمل ہے جن میں انسان اپنے آپ کو مبتلا کرتا ہے۔ ان ساری مشقوں سے گزر کر انسان تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کے مراحل عبور کرتا ہوا فنا سے بقا کی طرف سفر کرتا ہے۔

(۳) جذب

جب انسان خود شناسی، خود آگہی اور تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب کے مراحل طے کر لیتا ہے تو پھر اللہ

رب العزت اسے جذب عطا فرماتا ہے جو فنا کے راستے میں سب سے مؤثر دوا ہے۔ جذب کے مرحلے میں انسان کسی کے ساتھ عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے یعنی کسی کے ساتھ اس کا دل لگ جاتا ہے اور پھر اس کی یاد میں ہمہ وقت رہنا اسے اچھا لگتا ہے۔ اس کی باتیں کرتے رہنا اسے اچھا لگتا ہے، اس کے بارے میں سوچتے رہنا اسے اچھا لگتا ہے، اس کی اداؤں کو دہرانا اسے اچھا لگتا ہے اور اس جیسا روپ اختیار کرنا اور اس جیسا لگنا بھی اسے اچھا لگتا ہے۔ یہ تمام عشق کی کیفیات ہیں۔ گویا جب انسان کو جذب نصیب ہو جاتا ہے تو پھر وہ عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ خواہ یہ شیخ و مرشد کا عشق ہی ہو جو اسے مولا سے ملا دیتا ہے۔ یوں اس کا عشق دنیا کو چھوڑ کر اخروی کائنات سے ہو جاتا ہے۔

(۴) کشف و حجاب

چوتھے مرحلے پر کشف و حجاب کی منزل آتی ہے اس مرحلے میں اللہ تعالیٰ حجاب اٹھاتا ہے اور کشف عطا فرماتا ہے۔ کشف سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے براہِ راست اپنی تربیت میں لے لیتا ہے۔ اب وہ اس کی تربیت آزمائش اور ابتلا کے ساتھ کرتا ہے۔

ایک موقع پر آپ ﷺ نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے علی تو مجھ سے محبت کرتا ہے اور یہ عمل میری محبت میں کیا ہے تو جان لے کہ جو مجھ سے محبت کرتا ہے اس کی طرف آزمائشیں یوں آتی ہیں جیسے ڈھلوان سے پانی آتا ہے۔

گویا اللہ رب العزت آزمائشوں کے ذریعے تربیت یوں کرتا ہے کہ جب سالک سے کوئی نافرمانی سرزد ہوتی ہے تو پھر اسے جھنجھوڑتا ہے۔ تیسرے مرحلے میں اس نے چونکہ عشق دیا ہے اور عشق کے مرحلے میں تکالیف نے آنا ہے، اس لیے حضور نبی اکرم ﷺ نے نشاندہی فرمادی کہ جب تم فنا کی راہ پر جذب کی منزل کو پہنچو گے تو پھر اس کے بعد انتظار کرنا خدا تمہیں اپنی تربیت میں لے لے گا۔ پھر صبح و شام زندگی کے معاملات میں زیر و بم آئے گا، وہ تمھیں کبھی ذہنی پریشانی اور کبھی مالی مشکلات میں مبتلا کرے گا۔ ارشاد فرمایا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ۔ (البقرہ، ۲: ۱۵۵)

”اور ہم ضرور بالضرور تمہیں آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے۔“

ان آزمائشوں کے بعد پھر فناء تامہ نصیب ہو گی جس کے اندر انسان اپنی ذات، انا، خودی اور خواہشات سب چیزوں کو فنا کر چکا ہوتا ہے اور اللہ کی صفات کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اور پھر بالآخر بقا کی وادی میں داخل ہو جاتا ہے۔

(جاری ہے)

راہِ محبت و شوق میں تعلق باللہ کے مختلف راستے

شیخ حماد مصطفیٰ المدنی القادری

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

”اور جو لوگ ہمارے حق میں جہاد (یعنی مجاہدہ) کرتے ہیں تو ہم یقینا انہیں اپنی (طرف سَیر اور وصول کی) راہیں دکھا دیتے ہیں۔“(العنکبوت،۲۹: ۶۹)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ تصوف، سلوک اور معرفت کے راستے کے حوالے سے اس امر کی طرف ہماری توجہ مبذول کروا رہا ہے کہ اللہ رب العزت اسی کو اپنی طرف آنے والے راستے کی ہدایت عطا فرماتا ہے جو مجاہدہ و ریاضت اور محنت و مشقت کرتے ہیں اور جو جہدِ مسلسل نہیں کرتے، انہیں کبھی اپنی طرف آنے والے راستوں کی طرف ہدایت عطا نہیں فرماتا۔

اللہ رب العزت نے اس آیت کریمہ میں جمع کا صیغہ ”السبل“ (کئی راستے) استعمال فرمایا کہ ہم اپنی طرف آنے والے راستوں کی طرف ہدایت عطا فرماتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس نے اپنے وصال اور قربت و معرفت کے لیے ایک راستہ نہیں بلکہ متعدد راستے عطا فرمائے ہیں۔ یہ راستے اگرچہ جدا جدا ہیں مگر ان راستوں کی منزل ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف میں کئی سلاسلِ طریقت؛ قادریہ، چشتیہ،

نقشبندیہ، سہروردیہ، شاذلیہ وغیرہ موجود ہیں۔ یہ سارے طرق اور راستے اللہ رب العزت کی جانب ہی جاتے ہیں اور انہی راستوں کے ذریعے اللہ کا قرب، اس کی معیت اور صحبت ملتی ہے۔

تعلق باللہ کا راستہ ایک ایسا راستہ ہے جس راستے سے اولیاء کاملین گزرے۔ وہ اس راہِ محبت و شوق، راہِ جستجو و آرزو، راہِ عشق، راہِ تقویٰ و پرہیز گاری، راہِ قناعت اور راہِ زہد و ورع سے نہ صرف خود گزرتے ہیں بلکہ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو بھی گزارتے ہیں۔ تصوف اور صوفیاء کی جملہ کتب اور رسائل کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کا آغاز بھی اسی تعلق باللہ کے سفر سے ہوتا ہے۔ یہ سفر کبھی بیابان اور بنجر زمین کا ہوتا ہے، کبھی ویران صحراؤں اور غیر آباد بستیوں اور شہروں کا ہوتا ہے۔ جوں جوں سالک اس سفرِ عشق و محبت میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے تو اس کا سفر بیابان و بنجر زمین سے رفتہ رفتہ سرسبز و شاداب باغات کی طرف چلا جاتا ہے اور جوں جوں یہ سفر اپنے نقطۂ کمال کی طرف بڑھتا ہے تو ایک مقام پر جا کر یہ سفر محبوب کی گلیوں تک مکمل ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید میں مذکور درج ذیل واقعہ سے بھی اولیاء و صوفیاء یہ امر مستنبط کرتے ہیں کہ اللہ کی طرف جانے والے راستے متعدد ہیں۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی کہ اے موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے ہمارے لیے بارش طلب کریں کیونکہ ہمیں پانی کی اشد ضرورت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے درخواست گزار ہوتے ہیں:

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ۔

”اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے فرمایا: اپنا عصا اس پتھر پر مارو، پھر اس (پتھر) سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، واقعتاً ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ پہچان لیا۔“ (البقرہ، ۲: ۶۰)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کی ضرب سے اس پتھر سے 12 چشموں کا پھوٹ پڑنا، اس امر کا اللہ رب العزت کے فرمان: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا سے گہرا تعلق ہے۔ اس آیت کریمہ سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت کی قربت اور اس کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں یہ دراصل 12 مشارب اور چشمے ہیں جو اپنے مزاج، خصلتوں اور میلانات میں جدا جدا ہیں مگر ان کا سرچشمہ ایک ہوتا ہے۔ تصوف و معرفت اور سلوک میں کئی مزاج ہوتے ہیں، کسی کو اللہ رب العزت کی قربت طریقِ عشق سے ملتی ہے۔۔۔ کسی کو طریقِ معرفت اور طریقِ زہد و ورع سے ملتی ہے۔۔۔ کسی کو تقویٰ اور پرہیز گاری کی روش سے ملتی ہے۔۔۔ علی ھذا

القیاس یہ راستے جدا جدا ہیں۔ ان راستوں پر چلنے، گامزن ہونے اور مجاہدہ کرنے سے اللہ رب العزت اپنی قربت ضرور بالضرور عطا فرماتا ہے۔

امم پر نعمتوں کا نزول انبیاء اور صلحاء کے وسیلہ سے ہوتا ہے

یہاں ضمناً اس بات کو بیان کر دوں کہ بنی اسرائیل اپنے اعمال و احوال کے حوالے سے جیسے بھی تھے مگر ان کا عقیدہ دیکھئے کہ اگر وہ لوگ چاہتے تو اللہ رب العزت سے براہِ راست بارش طلب کر لیتے کہ اے باری تعالیٰ ہمیں بارش عطا فرما تا کہ ہم سیراب ہو جائیں مگر انھوں نے اللہ سے براہ راست مانگنے کے بجائے اپنے بر گزیدہ نبی سے درخواست کی کہ اے موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے آپ خود درخواست کریں تا کہ وہ آپ کے ذریعہ ہمیں پانی عطا فرمائے۔

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو بنی اسرائیل کو براہ راست پانی کی نعمت سے سرفراز فرما دیتا مگر اس نے ایسا اس لیے نہیں کیا تا کہ لوگوں پر یہ واضح ہو جائے کہ خدا سے براہ راست حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ اس امت کے نبی اور رسول کے ذریعے اس کی نعمت حاصل کی جاتی ہے۔ لہذا امت اس سبب اور واسطے کو کبھی نہ بھولے۔

یاد رکھیں! جو بھی نعمت کسی قوم یا جماعت کو ملتی ہے، وہ اس قوم کے رہنما اور رہبر کی وساطت سے ملتی ہے۔ اللہ رب العزت اس chain of command کے تحت اپنے احکامات جاری فرماتا ہے۔ بلا تشبیہ و بلا مثال جس طرح قومی و نجی اداروں میں ایک Chain of Command ہوتی ہے، جس کی پاسداری ہر صورت لازمی ہوتی ہے۔ اللہ رب العزت بھی اسی chain of

command کی طرف ہماری توجہ مبذول کروارہا ہے کہ ہم جو کچھ متائے دنیا عطا کرتے ہیں تو وہ کسی کے ذریعے اور وسیلہ سے عطا کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللهُ يُعْطِي

(المسند الجامع، ۴۴: ۲۲۴، الرقم: ۱۴۵۳۳)

بے شک عطا خدا کی ہے مگر تقسیم مصطفی ﷺ کی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ گزشتہ امم میں اللہ رب العزت نے انبیاء و رسل عظام علیہم السلام کو اپنی امتوں کا پیشوا اور ہمنا بنایا اور ان کے ذریعے نعمتوں کا نزول فرماتا رہا لیکن جب نبوت و رسالت کا دروازہ بند ہو گیا تو پھر اللہ رب العزت اپنی مخلوق پر نعمتوں کا نزول کس کے وسیلہ و واسطہ سے کرے گا؟ اس کا جواب شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری یوں دیتے ہیں کہ بے شک انبیاء و رسل علیہم السلام کی تشریف آوری کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے، نبوت و رسالت کا دروازہ بند ہو چکا ہے لیکن سلسلہ رشد و ہدایت ختم نہیں ہوا۔ اولیاء، صلحاء اور مجددین کی صورت میں امت کے رہنما و پیشوا کے آنے کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

وہ ہستیاں جنہوں نے اس راہِ عشق و محبت میں سفر کیا اور منزلیں حاصل کیں اور اس راہِ عشق و محبت کے اعلیٰ مقام و مرتبہ پر فائز ہوئیں، انھوں نے یہ مقام مجاہدہ و ریاضت سے حاصل کیا اور اس سلسلہ میں ہر طرح کی آسائش کو ترک کرتے ہوئے ہر امتحان میں کامیاب ہوئیں۔

شہنشاہ بلخ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ ایک رات اپنے محل کی چھت پر آرام فرما رہے تھے کہ اچانک ایک شخص اُن کے پاس محل کی چھت پر پہنچ جاتا ہے۔ آپ اس سے پوچھتے ہیں کہ وہ کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں آپ کا ایک پرانا آشنا ہوں۔ میرا اونٹ گم ہو گیا ہے، اس کی تلاش میں آیا ہوں۔ آپ نے جواب دیا کہ آپ نے بڑی عجیب بات کی ہے، محل کی چھت پر اونٹ کیسے تلاش کیے جا سکتے ہیں؟ اس نے کہا کہ اس سے بھی بڑی عجیب بات یہ ہے کہ آپ تخت و تاج میں خدا کو ڈھونڈ رہے ہیں اور اس آرام و آسودگی کی زندگی میں خدا کے متلاشی ہو۔

یہ بات سن کر آپ نے اس شخص سے پوچھا کہ تو اپنا تعارف کروایا۔ اس نے کہا کہ میں اللہ رب العزت کا ایک فرشتہ ہوں اور آپ کو اس راہِ محبت و شوق کے راستے پر گامزن کرنے آیا ہوں، جو راستہ خدا سے ملاتا ہے۔ یہ سن کر حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے تاج و تخت اور شہنشاہی والی زندگی ترک کر دی اور 9 سال تک نیشاپور کے غاروں میں خلوت نشینی اختیار کیے رکھی۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

ریاضت و مجاہدہ کے بغیر محبتِ الٰہی کا حصول ناممکن ہے

ہمارا یہ مقام، کیفیت اور حال ہے کہ ہم آسودگی، آرام اور سہولت کی زندگی بسر کررہے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم خدا کو پانے کی جستجو کررہے ہیں۔ اگر ہم نے اسی راہِ محبت و شوق کا مسافر بننا ہے اور اسی راہِ محبت و عشق پر گامزن ہونا ہے تو خلوت نشینی کو اختیار کرنا ہوگا۔ آج کے دور میں پہاڑوں اور غاروں میں خلوت نشینی مشکل اور ناممکن ہے۔ اب ہمارے لیے یہی فارمولا ہے کہ ہم اپنے دلوں کی غار میں خلوت نشینی اختیار کریں۔ اپنے دلوں میں ڈوب کر اللہ رب العزت کا ذکر کرتے کرتے اسے تلاش کریں۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ رب العزت سے عرض کی کہ:

یا رب! أرنی أهل محبتك۔ فقال: یا داؤد! أئت جبل لبنان فإن فیه أربعة عشر نفسا۔ فیهم شبان وفیهم شیوخ وفیهم کهول فإذا أتیتهم فأقرئهم منی السلام وقل لهم إن ربکم یقرئکم السلام ویقول لکم ألا تسألون حاجة فإنکم أحبائی وأصفیائی وأولیائی أفرح لفرحکم وأسارع إلی محبتکم

فأتاهم داود علیه السلام فوجدهم عند عین من العیون یتفکرون فی عظمة الله عزوجل فلما نظروا إلی داود علیه السلام نهضوا لیتفرقوا عنه۔

(احیاءعلوم الدین، باب: الشوق الی اللہ تعالیٰ، ۴: ۳۲۵)

باری تعالیٰ مجھے اپنے اہل اللہ، اہلِ محبت اور اہلِ شوق کا دیدار عطا فرما۔ اللہ رب العزت نے حضرت داؤد علیہ السلام سے حکم فرمایا کہ اے داؤد! لبنان کے پہاڑ پر چلے جاؤ، وہاں چودہ افراد ایسے رہتے ہیں جو میری محبت و عشق میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ان میں کچھ عمر رسیدہ، کچھ نو عمر اور کچھ درمیانی عمر کے ہیں۔ جب تم اُن کے پاس جاؤ تو میری طرف سے انھیں سلام کہنا اور اُن سے کہنا کہ تمھارا رب تم پر سلام کہتا ہے اور وہ تمھیں کہتا ہے کہ تم مجھ سے اپنی حاجات کا سوال کیوں نہیں کرتے۔ بے شک تم میرے محبوب اور اولیاء ہو، میں تمھاری خوشی سے خوش ہوتا ہوں اور تمھاری محبت کی طرف رغبت رکھتا ہوں۔

جب حضرت داؤد علیہ السلام ان تک پہنچے تو وہ سب اللہ رب العزت کا ذکر کررہے تھے اور اس کی عبادت میں مشغول تھے اور آنسو بہا رہے تھے۔ جب آپ ان کی طرف بڑھتے ہیں تو وہ منتشر ہو جاتے ہیں۔

شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ لوگ اللہ کی محبت میں ڈوبے ہوئے تھے، اس لیے وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہمارا راز فاش ہو جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی عشق و مستی اور وارفتگی کے اس عالم سے کوئی آگاہ و آشنا نہ ہو جائے اور یہ راز خدا اور ان کے درمیان رہے۔

فقال داود إني رسول الله إليكم جئتكم لأبلغكم رسالة ربكم فأقبلوا نحوه وألقوا أسماعهم نحو قوله وألقوا أبصارهم إلى الارض۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ مت گھبراؤ، جس کی یاد میں تم گم ہو، جس کی خشیت و خضوع میں ڈوبے ہوئے ہو، میں اسی محبوبِ حقیقی کی جانب سے تمھارے لیے ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔ چنانچہ وہ تمام حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس آگئے اور اپنی سماعتوں اور بصارتوں کو ان کی طرف متوجہ کر لیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان سے کہا:

إني رسول الله إليكم يقرئكم السلام۔ ويقول لكم ألا تسألون حاجة ألا تنادوني أسمع صوتكم وكلامكم فإنكم أحبائي وأصفيائي وأوليائي أفرح لفرحكم وأسارع إلى محبتكم۔

بے شک میں تمھاری طرف اللہ کا پیامبر بن کر آیا ہوں، وہ تمھیں سلام بھیجتا ہے۔

یہ سلام دراصل ان کی عبادات کی قبولیت کا پیغام تھا کہ انھوں نے راتیں اللہ کی یاد، جستجو، ذکر، آرزو اور تلاش میں بسر کیں۔ عشاق اور محبین کی یہی معراج ہے کہ جس سے محبت، پیار اور عشق ہو تو اس کی جانب سے ایک پیار بھرا پیغام اور ندا آجائے اور اس کی جانب سے ایک محبت بھرا سلام آجائے۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ رب العزت نے تم سے یہ پوچھا ہے کہ کیا تمھاری کوئی حاجت ہے کہ تمہاری حاجت روائی کر سکوں۔۔۔ کوئی سوال ہے کہ میں وہ سوال پورا کر دوں۔۔۔ میں تمھاری ندائیں، مناجات اور کلام بھی سنتا ہے۔۔۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔ تمھاری خوشی میں میری خوشی ہے، جس بات پر تم خوش ہوتے ہو، میں اس پر خوش ہوتا ہوں۔۔۔ جو محبت تم مجھ سے کرتے ہو، تمہاری وہ محبت، وارفتگی اور عشق بعد میں ہوتا ہے، میں تمہاری محبت سے پہلے خود تم سے محبت کرتا ہوں۔

قرآن مجید میں بھی اسی بات کو یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ۔ (المائدۃ، ۵: ۷)

”اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے گا تو عنقریب اللہ (ان کی جگہ) ایسی قوم کو لائے گا جن سے وہ (خود) محبت فرماتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے۔“

اس سے اندازہ ہوا کہ ہم پہلے خدا سے محبت نہیں کرتے بلکہ خدا پہلے ہم سے محبت کرتا ہے اور پھر ہمیں محبت کرنے کا اذن عطا فرماتا ہے تو ہم اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

پس حضرت داؤد علیہ السلام نے ان اولیاء کو یہی پیغام دیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اے مجھ سے محبت کرنے والو! یہ مت سمجھنا کہ تم یونہی مجھ سے محبت کر رہے ہو بلکہ تمھیں محبت کرنے کا اذن

میں نے خود عطا فرمایا ہے اور اسی اذن اور توفیق کی وجہ سے تمہیں یہ سعادت نصیب ہوئی ہے۔ تم جو راتیں ان پہاڑوں پر بسر کر رہے ہو، میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ رات بھر میری جستجو، آرزو اور میری یاد میں اس لیے گم رہتے ہو کہ تمھیں میرے دیدار کی تمنا اور ملاقات کا شوق ہے۔ میں اس شوق دیدار کی تڑپ، لگن اور چاہت سے باخبر ہوں اور میری خبر لینے کی وجہ سے ہی یہ تمھاری جستجو، آرزو اور تمنا قائم ہے۔ گویا یہ خدا کی نظرِ التفات کا ہی نتیجہ ہے کہ اس کے محبین اور عشاق کو یہ توفیق ملتی ہے کہ وہ اپنے خدا کو یاد کریں اور اس کے دیدار سے متمتع ہوں۔ حضرت داؤد علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

فجرت الدموع علی خدو دھم۔

اللہ رب العزت کا پیغام سن کے ان اولیاء کے رخساروں پر اشک کی جھڑی رواں ہو جاتی ہے۔

گویا اشک بہانا بھی اس کی قربت اور اس تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اگر دل سخت ہو جائیں تو بکاء اور گریہ وزاری نصیب نہیں ہوتی۔ لہذا تقاضا یہی ہے کہ ہم اللہ رب العزت کی یاد میں راتیں بسر کریں، اس کی آرزو، جستجو اور اس کے شوقِ دیدار میں صبح و شام بسر کریں۔ یہی ایک راستہ ہے جس سے ہمیں اپنی منزلِ مقصود مل سکتی ہے۔ اسی راستے پر گامزن ہونے کا درس تحریک منہاج القرآن اور شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دے رہے ہیں۔

خشیتِ الٰہی میں بہائے گئے آنسوؤں کی قدر و منزلت

خشیتِ الٰہیہ اور شوقِ دیدار میں بہائے گئے آنسوؤں کی قدر و منزلت اللہ کے ہاں بہت بلند ہے۔ جب آنسوؤں کے قطرے بہتے ہیں تو اللہ رب العزت ان قطروں کو رائیگاں نہیں جانے دیتا بلکہ اس سے دل کی بنجر زمین آباد ہو جاتی ہے۔ جب خدا ان دلوں پر اپنی نگاہِ التفات فرماتا ہے تو پھر ان دلوں سے عشق، معرفت اور شوقِ دیدارِ الٰہی کی نہریں بہہ نکلتی ہیں۔ چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور ان چشموں میں سے ایک چشمہ اللہ کی قربت کی طرف لے جاتا ہے۔۔۔ ایک چشمہ معرفت کی طرف جاتا ہے۔۔۔ اور ایک چشمے سے خدا کا دیدار ملتا ہے۔ گویا یہ آہ و بکا اور خشیت بھی قربِ الٰہی کا ایک راستہ ہے اور تعلق باللہ کا اہم ذریعہ ہے۔

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ:

كَانَ رَجُلٌ يُسْرِفُ عَلَى نَفْسِهِ فَلَمَّا حَضَرَهُ الْمَوْتُ قَالَ لِبَنِيهِ إِذَا أَنَا مُتُّ فَأَحْرِقُونِي ثُمَّ اطْحَنُونِي ثُمَّ ذَرُّونِي فِي الرِّيحِ فَوَاللهِ لَئِنْ قَدَرَ عَلَيَّ رَبِّي لَيُعَذِّبَنِّي عَذَابًا مَا عَذَّبَهُ أَحَدًا فَلَمَّا مَاتَ فُعِلَ بِهِ ذَلِكَ فَأَمَرَ اللهُ الْأَرْضَ فَقَالَ اجْمَعِي مَا فِيكِ مِنْهُ فَفَعَلَتْ فَإِذَا هُوَ قَائِمٌ فَقَالَ مَا حَمَلَكَ عَلَى مَا صَنَعْتَ قَالَ يَا رَبِّ خَشْيَتُكَ فَغَفَرَ لَهُ۔ (بخاری، الصحیح، باب ام حسبت ان اصحاب الکہف، ۱۱: ۳۰۰)

ایک ایسا شخص تھا جس نے گناہ و نافرمانی کے باعث اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھا کہ وہ اپنے رب کے سامنے پیش ہو۔ اس شخص نے گناہ لغزش اور ظلم و زیادتی کے باعث اپنے بیٹوں سے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو میں اس قابل نہیں ہوں کہ مجھے زمین دفنایا جائے لہذا مجھے جلا دینا۔ پھر میری لاش کو ریزہ ریزہ کر دینا۔ پھر میری راکھ کو ہواؤں میں اڑا دینا تاکہ میرا نام و نشان تک مٹ جائے۔ بیٹوں نے ایفائے عہد کیا اور مرنے کے بعد اپنے باپ کی لاش کو جلایا اور اس کی راکھ کو ہواؤں میں اڑا دیا۔

اللہ رب العزت نے زمین سے کہا کہ اس کے ذرات کو جمع کرو اور اسے میرے سامنے پیش کرو۔ جب وہ شخص اللہ کے سامنے پیش ہوا تو اللہ رب العزت نے اس سے فرمایا: تجھے کس چیز نے یہ کام کرنے پر آمادہ کیا۔۔۔؟ جواب دیا اور کسی چیز نے مجبور نہیں کیا صرف خشیتِ الٰہی تھی کہ خیال آیا میں اپنے ہونے کو مٹا دوں، اپنے وجود کو ختم کر دوں۔ باری تعالیٰ فرماتا ہے کہ فرشتو! سن لو! کہ میں نے اسے بخش دیا ہے اور معاف کر دیا ہے۔

اگر ہم اپنا جائزہ لیں تو کیا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس قابل ہیں کہ اپنے رب کے حضور پیش ہو سکیں۔ کیا ہم اس قابل ہیں کہ اللہ رب العزت اپنی نظرِ التفات ہماری طرف فرمائے۔ بیدم کہتے ہیں:

وہی دل ہے جو حسن و عشق کا کاشانہ ہو جائے
وہی سر ہے جو کسی تیغ کا نذرانہ ہو جائے
یہاں ہونا، نہ ہونا ہے اور نہ ہونا عین ہونا ہے
جسے ہونا ہو کچھ، خاکِ درِ جاناں ہو جائے

جو خاک در جاناں نہیں ہوتے، اللہ رب العزت کی بارگاہ میں خاک بسر نہیں ہوتے، اللہ رب العزت انہیں کچھ عطا نہیں کرتا لیکن جو اللہ رب العزت کی بارگاہ میں خاک بسر ہو جاتے ہیں، اللہ رب العزت ان کو سب کچھ عطا فرما دیتا ہے۔ حتی کہ لذتِ دیدار بھی عطا فرماتا ہے۔ اگر ہم بھی اس کے حضور جانے کے قابل نہیں ہیں تو صرف یہی راستہ ہے کہ اپنے نفوس کو اپنی خواہشات و شہوات کو حتی کہ اپنی ترجیحات کو ریزہ ریزہ کر دیں۔ تب اللہ کا قرب نصیب ہو گا۔ جب ہم اللہ رب العزت کے حضور خود کو مٹا دیتے ہیں۔ خود کو جلا دیتے ہیں، اپنے وجود کو مسمار کر دیتے ہیں اور معرفت و عشقِ خدا میں خود کو فنا کر دیتے ہیں تو بقا نصیب ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے آنسوؤں کے قطروں کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

عَيْنَانِ لَا تَمَسُّهُمَا النَّارُ: عَيْنٌ بَكَتْ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ وَعَيْنٌ بَاتَتْ تَحْرِصُ فِي سَبِيلِ اللهِ۔ (السنن الترمذی، باب ماجاء فی فضل الحرص فی سبیل اللہ، ۴: ۱۷۵)

دو آنکھیں ایسی ہیں جنہیں دوزخ کی آگ نہیں چھو سکتی: ایک وہ آنکھ جو اللہ رب العزت کی خشیت میں آنسو بہاتی ہے اور ایک وہ آنکھ جو اللہ رب العزت کی یاد میں جاگ کر راتیں بسر کرتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عشق میں آنسو تو گنہگار بھی بہاتے ہیں۔ دوزخ کی آگ ان آنکھوں کو مس کیوں نہیں کر سکتی۔؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان آنسوؤں کی نسبت بہت بلند ہے۔ ان کی نسبت کبھی عرش الٰہی سے ہوتی ہے اور کبھی عالمِ لامکاں سے ہوتی ہے۔۔۔ کبھی حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ سے ہوتی ہے۔۔۔ کبھی اللہ کے اولیاء و صلحاء سے ہوتی ہے۔ یہ قطروں کی نسبت پر منحصر ہے کہ وہ کتنا اعلیٰ و ارفع نسبت کے ساتھ گرا ہے۔ اس لیے خدا دوزخ کی آگ کو اجازت ہی نہیں دیتا کہ وہ ان آنکھوں کو مس کر سکے۔

پس ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ رب العزت کی یاد میں راتیں بسر کریں، اس کی آرزو، جستجو، اس کے شوقِ دیدار اور شوقِ ملاقات میں زندگی کا ہر لمحہ بسر کریں۔ یہی ایک راستہ ہے جس سے منزلِ مقصود مل سکتی ہے۔

قربانی کا فلسفہ وحکمت اور احکام ومسائل

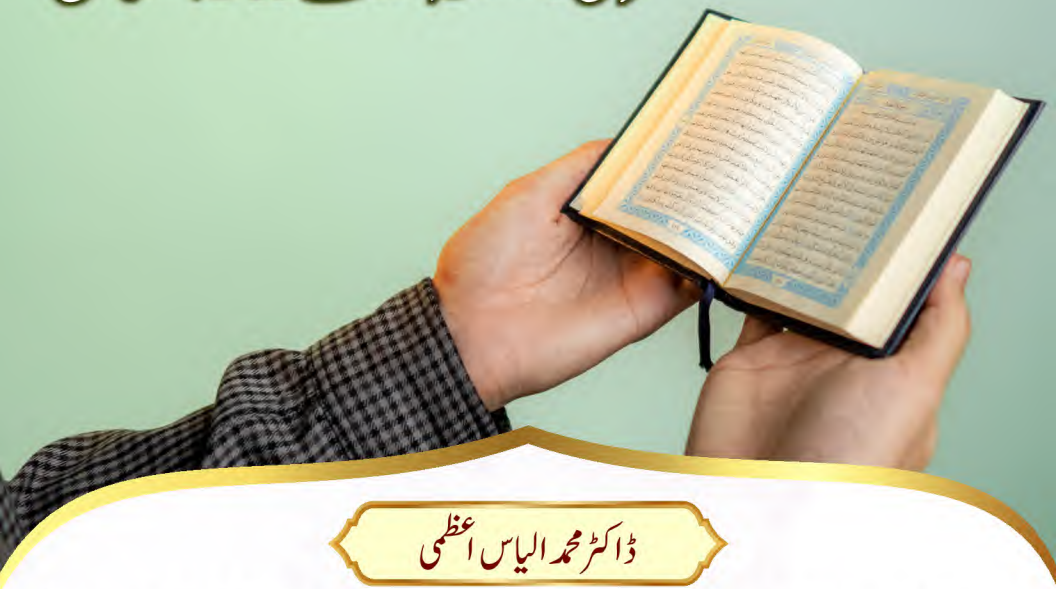

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی

یہ کائنات جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، اس کے سفرِ تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہوئے حصۂ عبادات میں جب ہم قربانی کے باب پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے ہی خالقِ کائنات نے اپنی تمام مخلوقات میں سے اشرف المخلوقات انسان کو جن عبادات کی ادائیگی لازم قرار دی ہے، اُن میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور قربانی کی عبادات شامل ہیں، اگرچہ مختلف شرائع وادوار میں ان کی شکل وصورت اور ادائیگی کے طریقے مختلف رہے ہیں۔ دین محمدی جو جملہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کا تسلسل اور ان کی ادائیگی کی آخری اور کامل واکمل صورت گری و عملی اظہار کا نام ہے اس کے نظام عبادات میں بھی ان جملہ عبادات کو اساسی عبادات کا درجہ حاصل ہے۔ اس لیے تمام اہلِ اسلام کو بعض شرائط کے ساتھ ان کی بجاآوری کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے۔ ان عبادات کی ادائیگی پر انعاماتِ الٰہیہ کا وعدہ دیا گیا ہے اور ترک کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت تنبیہات اور عقوبات کی وعید سنائی گئی ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں ہم قربانی کی عبادت سے متعلق چند معروضات اپنے قارئین کی ضیافتِ علمی کے طور پر پیش کرتے ہیں:

امام اصفہانی قربانی کا شرعی مفہوم واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والقربان: مایتقرب به الی الله وصارفی التعارف اسما للنسیکة التی هی الذبیحة۔ (المفردات راغب، ص:۳۹۹)

قربان سے مراد ہر وہ (چیز یا عمل ہے) جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے مگر تعارف کے اعتبار سے نسیکہ یعنی ذبیحہ کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ قربان؛ قریب ہونے کے معنی میں ہی استعمال ہوتا ہے مگر اب جب قربان بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذبیحہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

قربانی کا تاریخی پس منظر

قربانی کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسان کی تاریخ پرانی ہے۔ اس کا واضح ثبوت سورۃ المائدۃ میں مذکورہ حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں بیٹوں کے قربانی کرنے کا واقعہ ہے، ان میں سے ہابیل کی قربانی قبول ہو جانے اور قابیل کی قربانی قبول نہ ہونے کا بیان ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ۔ (المائدۃ، ۵:۲۷)

”(اے نبی مکرم!) آپ ان لوگوں کو آدم (علیہ السلام) کے دو بیٹوں (ہابیل و قابیل) کی خبر سنائیں جو بالکل سچی ہے جب دونوں نے (اللہ کے حضور ایک ایک) قربانی پیش کی سو ان میں سے ایک (ہابیل) کی قبول کر لی گئی اور دوسرے (قابیل) سے قبول نہ کی گئی۔“

قرآن مجید نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ انسان کو زمین پر بھیجنے کے ساتھ ہی قربانی کا حکم بھی دے دیا گیا تھا اور یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ قربانی جیسا عمل جس میں جانور کا خون بہایا جاتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اسی وقت شرفِ قبولیت پاتا ہے جب وہ دل کے تقویٰ اور اخلاصِ نیت سے کی جائے۔ اسی تصور کو واضح کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ۔

”ہرگز نہ (تو) اللہ کو ان (قربانیوں) کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون مگر اسے تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچتا ہے۔“ (الحج، ۲۲: ۳۷)

قرآن مجید قربانی کے تاریخی پس منظر کو اس طرح بیان کرتا ہے:

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ۔ (الحج، ۲۲: ۶۷)

”ہم نے ہر ایک امت کے لیے (احکامِ شریعت یا عبادت و قربانی کی) ایک راہ مقرر کر دی ہے، انہیں اسی پر چلنا ہے۔“

دنیائے عالم میں پائے جانے والے مذاہب میں سے تین مذاہب یہودیت، مسیحیت اور اسلام کو عام طور پر ابراہیمی مذہب یاالہامی وآسمانی مذاہب تسلیم کیا جاتا ہے، ان تمام میں قربانی کا تصور پایا جاتا ہے:

☆ عہد نامہ جدید کی اناجیل اربعہ میں سے ایک اہم ترین کتاب لوقا کی انجیل میں ہے کہ:

جیسا کہ خداوند کی شریعت میں لکھا ہے کہ ہر ایک پہلوٹا خداوند کے لیے مقدس ٹھہرے گا اور خداوند کی شریعت کے اس قول کے موافق قربانی کریں کہ قمریوں کا ایک جوڑا یا کبوتر کے دو بچے لاؤ۔ (لوقا، ب ۲، جملہ ۲۵)

☆ یہودی نظریہ کے مطابق قربانی کے گوشت کو جلادیا جاتا ہے۔ گوشت جل جانے کو قربانی کی قبولیت اور نہ جلے تو قربانی کے رد ہو جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کو سوختنی قربانی بھی کہا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ قربانی یہودی مذہب میں عبادت میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں یہود میں مختلف قسم کی قربانیاں متعارف ہیں، مثلاً: سوختنی قربانی، خطاء کی قربانی، جرم کی قربانی۔ (قادری، عبدالرشید، ڈاکٹر، ادیان عالم، دانیال اکیڈمی، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص ۳۲۱)

☆ ایک انگریز ماہر مذاہب لیوس مور اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

دنیا کے تمام قدیم اور جدید مذاہب میں قربانی سب سے زیادہ مشترک وظائف میں سے ایک ہے۔ پوری تاریخ میں لوگوں کو دیوتاؤں، روحوں، بدروحوں اور آباء واجداد کے لیے تقریباً ہر قابلِ تصور چیز کی قربانی دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اکثر قربانیاں حیوانات کی ہوتی ہیں۔ جنہیں ذبح کیا جاتا ہے اور پھر دیوتاؤں کے سامنے پکایا اور کھایا جاتا ہے۔ (لیوس مور، مذاہب عالم کا انسائیکلو پیڈیا، نگارشات، لاہور، ط، اول، ۲۰۰۵ء، ص: ۲۹)

☆ رشید احمد امریکی اقوام میں قربانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

امریکی اقوام میں قربانی کی مختلف صورتیں پائی جاتی ہیں۔ انسانی قربانی کا رواج میکسیکو میں بہت عام ہے۔ حیوانات کی قربانی خونی اور آتشیں دونوں طرح سے دی جاتی ہے۔ خونی قربانی کی صورت میں گوشت قربانی کرنے والے خود کھالیتے ہیں۔ قربانی کے لیے کتوں کو دوسرے جانوروں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ کتے دو یا تین یا پانچ کی تعداد میں بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں۔ (رشید احمد، تاریخ مذاہب، زمرد پبلی کیشنز کوئٹہ، ط، آٹھویں، ۲۰۰۵، ص: ۴۳)

مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید اور بائبل و دیگر کتب کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ عبادت کے طور پر قربانی کا عمل ابتدا ہی سے الہامی و غیر الہامی مذاہب کے عباداتی امور کا ایک اہم عمل رہا ہے۔ اگرچہ اہلِ اسلام کے علاوہ دیگر اقوام اپنی دیگر عبادات کی طرح اس

عبادتِ قربانی کو بھی ترک کر بیٹھی ہیں اور آج ان کے اندر یہ عمل مفقود ہے جبکہ مسلمان ہر ذوالحجہ کے مخصوص ایام (۱۰، ۱۱، ۱۲) میں اپنے جانور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ذبح کرتے اور خوشی و مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔

دینِ اسلام میں وجوبِ قربانی کی دلیل

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ (الکوثر، ۱۰۸: ۲)

"پس آپ اپنے رب کے لیے نماز پڑھا کریں اور قربانی دیا کریں (یہ ہدیۂ تشکّر ہے)۔"

یہاں اللہ تعالیٰ نے ''انحر'' فرمایا ہے جو متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے لیکن مفسرین کرام نے یہاں پر اس کو عام طور پر قربانی کے معنی میں لیا ہے۔ امام راغب اصفہانی اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فصل لربك وانحر: هو حث على مراعاة هذين الركعتين وهما الصلوة ونحرالهدى وانه لابد من تعاطيهما فذلك واجب فى كل دين وفى كل ملة۔

(اصفہانی، المفردات، کتاب النون، ص: ۴۸۵)

اللہ تعالیٰ کے ارشاد فصل لربك وانحر میں نماز اور قربانی پر ابھارا گیا ہے اور ان دونوں کو ادا کرنا ضروری ہے اور یہ ہر دین وملت میں واجب رہی ہیں۔

دین اسلام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ بندۂ مومن کا ہر عمل خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، ظاہری ہے یا باطنی، اس کا مطلوب و مقصود صرف اور صرف رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہیے نہ کہ دنیوی نام و نمود اور شہرت و ناموری کی نفسانی خواہش۔ اس لیے قربانی کا عمل جو اگرچہ ایک جانور کے جسم پر واقع ہوتا ہے مگر جب ایک مطیع و فرماں بردار مسلمان اپنی حق حلال کی کمائی سے یہ جانور خریدتا ہے تو دین اسلام اسے اس امر کی خصوصی تاکید کرتا ہے کہ اے بندۂ خدا! تیرا ہر عمل تیرے خالق و مالک کی رضا و خوشنودی کے لیے ہی ہونا چاہیے۔ اس میں اگر کوئی اور غرض شامل ہو گئی تو تیرا اتنا بڑا عمل اور تیرا خرچ کردہ پیسہ ضائع ہو جائے گا۔ اسی لیے حضور سید عالم ﷺ کو حکم دیا جاتا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (الانعام، ۶: ۱۶۲)

"فرما دیجیے کہ بے شک میری نماز اور میرا حج اور قربانی (سمیت سب بندگی) اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔"

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی زندگی کے شب و روز کا ایک ایک لمحہ اس طرح سے گزرنا چاہیے کہ وہ اپنے مولا کی رضا کا طالب بن کر شاہراہِ حیات پر گامزن رہے۔ ''میری زندگی اور میری موت''، فرمانے میں یہی حکمت پوشیدہ ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دین اسلام میں دین و دنیا کی ثنویت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ یہ محض بندوں کا پیدا کردہ ایک مغالطہ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ قربانی کے عمل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اسی تصور و احساس کو ہمارے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ زکوٰۃ و صدقات (عبادات مالیہ) کی ادائیگی میں بھی درس پوشیدہ ہے کہ مال کمانے کے لیے اگرچہ بندے نے مشقت اٹھائی ہے لیکن اس کو خرچ کرنے کے لیے نعمتِ مال عطا کرنے والے مالکِ حقیقی کی ہدایات و احکامات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اس طرح اس کا مال کمانا اور خرچ کرنا دونوں ہی عبادت بن جائیں گے۔

قربانی: ارشاداتِ نبوی کی روشنی میں

شریعتِ اسلامیہ میں اوامر و نواہی کے ثبوت کے مصادر اصلیہ دو ہی ہیں: ۱۔ کتاب اللہ۔ ۲۔ سنت رسول اللہ ﷺ۔

قرآن مجید سے قربانی کی شرعی حیثیت، اس کی حکمت و اہمیت جان لینے کے بعد اب دوسرے مصدرِ شریعت احادیثِ نبویہ کی روشنی میں اس حکمِ الٰہی کی اہمیت و افادیت ملاحظہ ہو:

۱۔ عشرہ ذی الحجۃ کی فضیلت کو بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

ما من ایام احب الی اللہ ان یتعبد لہ فیھا من عشر ذی الحجۃ بعدل صیام کل یوم منھا بصیام سنۃ وقام کل لیلۃ منھا بقیام لیلۃ القدر۔ (مشکوۃ المصابیح، کتاب الصلوۃ، الفصل الثانی، ج ۱، رقم: ۱۴۷۱)

عشرہ ذی الحجہ سے بڑھ کر کوئی دن نہیں جن میں عبادت کرنا اللہ کے نزدیک محبوب تر ہو، اس عشرہ کے ہر دن کے روزے ایک سال کے روزوں کے برابر ہیں اور اس کی ہر رات کا قیام (عبادت) شب قدر کی عبادت کے برابر ہے۔

۲۔ قربانی بھی ذوالحجہ کی ۱۰، ۱۱، ۱۲ تاریخ کو کی جاتی ہے، جس کے متعلق ارشاد فرمایا:

ماعمل ابن آدم من عمل یوم النحر احب الی اللہ من اھراق الدم وانہ لیاتی یوم القیامۃ بقرونھا واشعارھا واظلافھا وان الدم لیقع من اللہ بمکان قبل ان یقع بالارض فطیبوا بھا نفسا۔ (سنن، الترمذی، کتاب الاضاحی، باب ماجاء فی فضل الاضحیۃ، رقم: ۱۴۹۳)

قربانی کے دن اللہ تعالیٰ کو خون بہانے سے زیادہ مسلمان کا کوئی عمل پسند نہیں ہے۔ قربانی کا جانور قیامت کے روز اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ آئے گا اور بے شک قربانی کا خون زمین پر

گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو جاتا ہے۔ پس تم خوش دلی کے ساتھ قربانی کیا کرو۔

۳۔ جب نبی اکرم ﷺ نے قربانی کی فضیلت بیان فرمائی اور اس کی رغبت دلائی تو اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خدمتِ اقدس میں سوال کیا:

یارسول اللہ! ما ھذہ الاضاحی؟ قال سنة ابیکم ابراھیم، قالوا: مالنا منھا؟ قال: بکل شعرة حسنة۔ قالوا یارسول اللہ فالصوف؟ قال بکل شعرة من الصوف حسنة۔

(سنن ابن ماجہ، ابواب الاضاحی، باب ثواب الاضحیۃ، رقم الحدیث: ۳۱۲۸)

یارسول اللہ! یہ قربانیاں کیا ہیں؟ فرمایا: تمھارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ عرض کیا: ہمارے لیے اس میں کیا ہے؟ (یعنی کیا ثواب ہے؟) فرمایا: ہر بال کے بدلے ایک نیکی (یعنی جانور کے ہر بال کے بدلے ایک نیکی ملے گی)۔ صحابہ نے عرض کیا: تو اون؟ (دنبہ، چھترا کی اون ہوتی ہے) تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اون کے ہر بال کے بدلہ میں ایک نیکی ہے۔

۴۔ قربانی کا جانور اگرچہ دوسرے سے بھی ذبح کروایا جاسکتا ہے مگر اپنے ہاتھ سے اپنا جانور ذبح کرنا یعنی اس کے گلے پر چھری پھیرنا زیادہ افضل عمل ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

ضحیٰ رسول اللہ ﷺ بکبشین املحین اقرنین، ذبحھما بیدہ وسمی وکبر، قال رایتہ واضعا قدمہ علی صفاحھما ویقول بسم اللہ واللہ اکبر۔

(صحیح بخاری، کتاب الاضاحی، باب التکبیر عند الذبح، رقم: ۵۵۶۵)

رسول اللہ ﷺ نے دو سینگ والے مینڈھے اپنے دست مبارک سے ذبح کیے اور بسم اللہ واللہ اکبر کہا۔ (انس) کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ اپنا قدم ان کے پہلوؤں پر رکھا اور بسم اللہ واللہ اکبر کہا۔

اسلام میں قربانی کی اہمیت

دین اسلام میں ذی الحجہ کے مقررہ دنوں میں قربانی کرنے کی اہمیت ان احادیث مبارکہ سے جانی جاسکتی ہے:

۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

من وجد سعة فلم یضح فلا یقربن مصلنا۔

(سنن ابن ماجہ، ابواب الاضاحی، باب الاضاحی، واجبۃ ھی ام لا، رقم: ۳۱۲۳)

جو طاقت رکھتے ہوئے قربانی نہ کرے، وہ ہماری عید گاہ کے قریب بھی نہ آئے۔

۲۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے عید بقر کے دن ہمیں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

ان اول مانبدا به فی یومنا هذا ان نصلی ثم نرجع فننحر فمن فعل ذلك فقد اصاب سنتنا ومن ذبح قبل ان نصلی فانما هو لحم عجله لاهله ليس من النسك فی شیء۔

(صحیح بخاری، کتاب الاضاحی، باب سنۃ الاضحیۃ، رقم ۵۵۶۰)

آج کے دن سب سے پہلا کام جو ہم کریں گے وہ یہ ہے کہ ہم نماز (عید بقر) پڑھیں پھر واپس آکر قربانی کریں۔ سو جس نے یہ کر لیا اس نے ہمارا طریقہ پالیا اور جس نے نماز سے پہلے ذبح کیا سو وہ گوشت تھا، جسے اس نے اپنے گھر والوں کے لیے جلدی تیار کر لیا، اس کا قربانی سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک اور حدیث مبارکہ میں ہے کہ

من كان ذبح قبل ان يصلی فليذبح اخری مكانها۔

(النسائی، السنن، کتاب الضحایا، باب الضحیۃ قبل الامام، رقم: ۴۴۰۳)

جس نے نماز عید سے پہلے جانور ذبح کر لیا وہ (نماز عید پڑھ کر اس کی جگہ) دوسرا (جانور) ذبح کرے۔

۳۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما قیام مدینہ کے دوران آپ ﷺ کا معمول بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اقام رسول الله ﷺ بالمدينة عشر سنين يضحی۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں دس سال قیام فرما رہے اور قربانی کرتے رہے۔ (جامع الترمذی، ابواب الاضاحی، باب الدلیل علی ان الاضحیۃ، رقم: ۱۵۰۷)

۴۔ حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ ہر سال عید بقر کے موقعہ پر دو جانور ذبح کرتے تھے جب ان سے اس کا سبب پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

ان رسول الله ﷺ اوصانی ان اضحی عنه فانا اضحی عنه۔

(ابوداؤد، السنن، ۳: ۲۲۷، رقم: ۲۷۹۰)

رسول اللہ ﷺ نے مجھے وصیت فرمائی تھی کہ میں حضور نبی اکرم ﷺ کی طرف سے قربانی دوں، سو میں آپ ﷺ کی طرف سے بھی قربانی کرتا ہوں۔

امت کی طرف سے قربانی

ام المومنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایمان افروز حدیث ملاحظہ ہو۔ فرماتی ہیں:

حضور نبی اکرم ﷺ نے سینگوں والا مینڈھا لانے کا حکم دیا۔ جو سیاہی میں چلتا ہو، سیاہی میں بیٹھتا ہو اور سیاہی میں دیکھتا ہو (مطلب یہ کہ اس کے پاؤں، پیٹ اور آنکھیں سیاہ ہوں) وہ قربانی کے لیے حاضر کیا گیا۔ فرمایا: عائشہ رضی اللہ عنہا! چھری لاؤ، پھر فرمایا: اسے پتھر پر تیز کرو۔ میں نے تیز کر دی پھر آپ نے چھری پکڑی، مینڈھا لٹایا، اسے ذبح کیا اور پھر فرمایا:

بسم اللہ اللھم تقبل من محمد وآل محمد ومن امۃ محمد۔

(مسلم، الصحیح، ۳: ۱۵۵۷، رقم: ۱۹۶۷)

الٰہی! یہ (مجھ) محمد، آلِ محمد اور امتِ محمدیہ کی طرف سے قبول فرما۔

احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے مذکورہ حدیث کو ان الفاظ کے اضافہ کے ساتھ یوں روایت کیا ہے:

اللھم ھذا عنی وعمن لم یضح من امتی۔

(جامع الترمذی، ابواب الاضاحی، باب مایقول اذا ذبح، رقم: ۱۵۲۱)

اے اللہ! یہ میری طرف سے اور میرے ان امتیوں کی طرف سے قبول فرما جو قربانی نہیں کر سکے۔

چونہ بھولا ہم غریبوں کو رضا ذکر اس کا اپنی عادت کیجئے

مذکورہ بالا احادیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ دینِ اسلام میں ہر صاحبِ استطاعت عاقل، مقیم، بالغ، مرد، عورت پر قربانی کرنا واجب ہے۔

عید قربان اور قربانی میں درس

عید قربان اور اس موقع پر اہلِ اسلام کے عملِ قربانی میں ہماری انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی و بین الاقوامی زندگی کے لیے جو درس پوشیدہ ہے، اس کو ذیل میں نکات کی صورت پیش کیا جاتا ہے تاکہ ہم اس میں غور و فکر کر کے اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھال سکیں:

۱۔ عید اور قربانی کے اس سالانہ تہوار کے موقع پر ہمیں ہر طرف خوشی و مسرت اور مبارکبادی کے مظاہر نظر آتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا عہد کرنا چاہیے کہ ہم اپنے معاشرے سے بدامنی، دہشت گردی، فرقہ واریت، گروہی تعصبات، باہمی نفرت و عداوت کے جاہلی جذبات و تصورات کو اپنے دل و دماغ اور فکر و عمل سے نکال کر ان کی جگہ باہمی اخوت و محبت بھائی چارہ، رواداری، تحمل و برداشت کے پاکیزہ انسانی تہذیبی رویوں کو فروغ دیں گے۔

۲۔ قربانی کا گوشت خواہ رشتہ داروں کو دیا جائے یا غرباء میں بانٹا جائے، یہ عمل ہر قسم کی لالچ اور منفعت سے پاک ہوتا ہے۔ بظاہر ان کا اس گوشت میں کوئی حق نہیں تھا مگر اس کے باوجود ان کو پہنچانا

ہمیں اس بات کا درس دیتا ہے کہ آئندہ ہم معاشرے میں رہتے ہوئے کسی کا حق غصب نہ کریں بلکہ دینِ اسلام کی سنہری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے معاشرے میں ایسی اقدار کو فروغ دیں کہ جس سے معاشرے میں حقوق و فرائض کا ایک متوازن ماحول پیدا ہو اور کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

۳۔ قربانی ہمیں اس امر کا درس دیتی ہے کہ جس طرح ہم نے اپنے خون پسینہ کی کمائی ہوئی دولت سے جانور خرید کر اس کو ذبح کرتے ہیں اور اس کا گوشت اپنے پرائے سب میں تقسیم کر دیتے ہیں، آئندہ عملی زندگی میں بھی عہد کریں کہ ہم اسی طرح اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت یہاں تک کہ اپنی جان کی نعمت کو بھی محض اس کی رضا و خوشنودی کے حصول کے لیے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہوئے اس کی مخلوق کی خدمت کریں گے۔

۴۔ ہم رضائے الٰہی کے حصول کے لیے ہر قسم کی ریاکاری سے بچتے ہوئے ہر عمل کو انتہائی خلوص سے سرانجام دیں۔

۵۔ عید قربان کے موقع پر حسبِ توفیق کھانا پکا کر محلے داروں اور قرب و جوار میں رہنے والے غرباء کو کھلانا چاہیے۔ اس سے وہ غرباء دل سے دعائیں بھی دیں گے اور ان کے دلوں میں اغنیاء و امرا کے لیے محبت بھی پیدا ہو گی۔ اس سے معاشرے میں طبقاتی تقسیم کی حوصلہ شکنی ہو گی اور باہمی پیار و محبت کے جذبات بھی فروغ پائیں گے، نفرتیں ختم ہوں گی اور الفتیں بڑھیں گی۔

۶۔ قربانی کی صورت میں پیسہ خرچ کرنے سے قلب و باطن سے دنیوی مال و دولت کی ہوس و حرص، لالچ اور مزید طلب کی خواہش ختم ہو جائے گی اور دل دنیا کی محبت سے خالی ہو کر اپنے خالق و مالک کی محبت و اطاعت کی جلوہ گاہ بنے گا۔

چند ضروری فقہی مسائل

قربانی کا لغوی معنی، شرعی مفہوم، تاریخی پس منظر اور فرامین نبویہ کی روشنی میں اس کی اہمیت و فضیلت جان لینے کے بعد اب قربانی کے جانور اور قربانی کے گوشت اور دیگر مختلف پہلوؤں کے حوالے سے چند ضروری احکام و مسائل ملاحظہ ہوں تاکہ ہر مسلمان پوری احتیاط اور کامل اطمینانِ قلبی کے ساتھ اس واجب کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

علماء قربانی کا شرعی حکم واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

خروج عن عهدة الواجب فی الدنیا الوصول الی الثواب بفضل الله تعالیٰ فی العقبیٰ۔

(فتاویٰ عالمگیری، ۵: ۲۹۴)

دنیا میں واجب کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا اور آخرت میں اللہ کے فضل سے اجر و ثواب پانا۔

صدر الشریعہ حضرت مولانا محمد امجد علی اعظمی قربانی کی فقہی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

مخصوص جانور کو مخصوص دنوں میں بہ نیت تقرب ذبح کرنا قربانی کہلاتا ہے۔ (بہار شریعت، ۱۵، ص ۸۲، ممتاز اکیڈمی لاہور)

واجب اور نفلی قربانی

بنیادی طور پر قربانی کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ واجب۔ ۲۔ نفلی

۱۔ واجب قربانی کی پھر تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ قربانی جو غنی اور فقیر دونوں پر واجب ہے جیسے نذر مانی ہوئی قربانی۔ نذر پوری ہو جانے کی صورت میں یہ امیر اور غریب جس نے بھی نذر مانی ہے، اس پر یہ قربانی واجب ہے۔

(۲) دوسری قربانی وہ ہے جو فقیر پر واجب ہے۔ مالدار پر واجب نہیں۔ یہ قربانی کا جانور خریدنے کے ساتھ واجب ہوتی ہے۔ یوں اگر فقیر قربانی کی نیت سے قربانی کا جانور خریدے کہ وہ اس کی قربانی کرے گا تو اس پر اس کی قربانی واجب ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس طرح اس فقیر نے جانور قربانی کی نیت سے خرید کر خود پر قربانی واجب کر لی ہے۔ جس کی ادائیگی اس پر لازم ہے جیسا کہ نذر کے طور پر کسی چیز کو مقرر کر لینے کی صورت میں اس کا پورا کرنا واجب ہے۔

(۳) قربانی کی تیسری قسم وہ ہے کہ امیر پر واجب ہے اور فقیر پر واجب نہیں جیسے عید الاضحیٰ کی قربانی۔ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکر ادا کرنے اور جد الانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سنت کو زندہ کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ قربانی کی اس تیسری قسم کا فلسفہ و حکمت یہ ہے کہ اصل میں یہ روزِ قیامت پل صراط کی سواری، گناہوں کے کفارے اور مغفرت کا وسیلہ و ذریعہ ہوتی ہے۔

۲۔ قربانی کی دوسری قسم نفلی قربانی ہے۔ ایسا فقیر اور ایسا مسافر جس کی طرف سے قربانی کی نذر پائی جائے اور نہ قربانی کی نیت سے جانور کی خریداری پائی جائے پھر بھی وہ قربانی کرے تو اس کی قربانی نفلی ہو گی۔ اس لیے کہ اس صورت میں وجوبِ قربانی کا سبب اور شرط دونوں ہی موجود نہیں ہیں۔ اس لیے اس مسافر اور فقیر کی قربانی نفلی ہو گی۔

قربانی کے جانور اور ان کی عمر

شارع علیہ الصلوۃ والسلام نے درج ذیل جانوروں کی قربانی مقرر فرمائی ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور جانور کی قربانی جائز نہیں، اگرچہ وہ حلال جانور ہی کیوں نہ ہو۔

اونٹ، اونٹنی: جو پانچ سال پورے کرے اور چھٹے سال میں قدم رکھ چکا ہو۔ بیل، گائے، بھینس: دو سال سے کم نہ ہو اور تیسرے سال میں داخل ہو چکی ہو۔ بکرا، بکری: ایک سال کی عمر پوری ہو، اس سے کم عمر کی قربانی جائز نہیں۔ دنبہ، مینڈھا، بھیڑ: ایک سال کی عمر کا ہو، ہاں اگر وہ چھ ماہ کا ہے اور اتنا صحت مند، طاقتور، قد و قامت رکھتا ہو کہ دور سے دیکھنے میں سال بھر کا معلوم ہو تو اس کی قربانی جائز ہے۔

جانوروں سے متعلق اہم مسائل

قربانی کے جانور کے لیے لازمی ہے کہ وہ خوبصورت، توانا، سالم الاعضاء، ہر قسم کے عیب اور نقص سے پاک ہو۔ ہاں البتہ اگر عیب اس قدر معمولی اور تھوڑا سا ہو کہ جو دیکھنے والے کو بآسانی نظر نہ آئے تو ایسے جانور کی قربانی جائز ہے۔ چند عیوب جن کے پائے جانے کی وجہ سے اس جانور کی قربانی جائز نہیں۔ ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں:

۱۔ جانور فحش عیب سے پاک ہو یعنی اندھا، کانا کہ اس کا کانا پن ظاہر ہو۔ ایسا لنگڑا کہ اس کا لنگڑا پن ظاہر ہو۔ اگر ایسا عیب اس جانور میں پایا گیا تو اس کی قربانی جائز نہیں۔

۲۔ اتنا کمزور کہ اس کی ہڈیوں میں گودہ باقی نہ بچا ہو اور وہ خود چل کر قربان گاہ تک نہ جا سکتا ہو۔

۳۔ اس کے دونوں یا ایک کان کٹا ہوا ہو تو اس کی قربانی کرنا بھی جائز نہیں۔

۴۔ کان، دم، ناک کا کچھ حصہ کٹا ہو اور کچھ موجود ہو تو اس صورت میں دیکھا جائے گا کہ اگر کٹا ہوا حصہ زیادہ ہے اور تھوڑا باقی بچا ہے تو اس کی قربانی جائز نہیں۔

۵۔ بکرے، مینڈھے، دنبے کے کان اگر فطری و پیدائشی طور پر چھوٹے چھوٹے ہوں تو ایسے جانور کی قربانی جائز ہے۔

۶۔ ایسا جانور جس کے جسم پر زخم ہو اور اس میں کیڑے پڑ گئے ہوں اور اس سے بدبو آ رہی ہو یا اس قدر گہرا زخم ہو کہ اس کی ہڈیاں نظر آئیں تو ان سب صورتوں میں سے کوئی ایک بھی صورت پائی جائے تو اس جانور کی قربانی جائز نہیں۔

۷۔ جانور کا سینگ اگر مینگ (جڑ) تک ٹوٹا ہوا ہے تو اس کی قربانی جائز نہیں لیکن اگر تھوڑا سا ٹوٹا ہے اور اس سے جانور کا عیب دار ہونا ظاہر نہیں ہوتا تو اس کی قربانی کرنا جائز ہے۔

عیب دار جانور کی قربانی ناجائز ہونے کی عقلی دلیل

بیمار اور عیب دار جانور کی قربانی جائز نہ ہونے کی شرعی دلیل تو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے

کہ انفاق فی سبیل اللہ کے لے ردی اور گھٹیا چیز نہ دو، جو تم خود لینا پسند نہیں کرتے۔ جبکہ حدیث مبارکہ میں حضور نبی اکرم ﷺ نے عیب دار جانور جیسے کانا، لنگڑا، اندھا اور اتنا کمزور کہ جو خود چل کر قربان گاہ تک نہ جاسکے، اس کی قربانی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ان شرعی دلائل کے علاوہ ایسے جانور کی قربانی جائز نہ ہونے کی عقلی دلیل یہ بھی ہے کہ انسان خود نفسیاتی طور پر ایسے جانور کو جو اگرچہ زندہ ہی ہو اس کا خریدنا اور رکھنا پسند نہیں کرتا۔ چہ جائیکہ اس کا گوشت کھانا۔ پھر اگرچہ ایسا جانور اس کو بلا قیمت بطورِ تحفہ ہی کیوں نہ پیش کیا جائے، وہ طبعی طور پر خوش دلی کے ساتھ اس کو لینا پسند نہیں کرتا۔ پس جو چیز انسان خود خریدنا یا بلا قیمت تحفتاً لینا نہیں چاہتا تو وہ اللہ کی راہ میں دینا کیوں کر جائز ہوگا؟ اس لیے نقل و عقل دونوں اس امر کے متقاضی ہیں کہ بیمار، لاغر، کمزور، خارش زدہ، ایسا زخمی کہ اس کے زخم میں کیڑے پڑ چکے ہوں اور اس کی ہڈیاں نظر آنے لگیں تو اس کی قربانی کرنا جائز نہیں۔

قربانی میں شراکت

شریعت نے قربانی کے لیے جو جانور مقرر کیے ہیں وہ تین قسم کے ہیں:

۱۔ بکرا، بکری، دنبہ، چھترا، بھیڑ، ایک آدمی کی طرف سے ایک جانور ذبح کیا جائے گا۔ ایک جانور میں ایک سے زیادہ قربانی کرنے والے شریک نہیں ہو سکتے۔ ان میں شراکت کی صورت میں کسی کی قربانی نہیں ہوگی۔

۲۔ گائے، بھینس، بیل نر و مادہ میں زیادہ سے زیادہ قربانی کرنے والے سات لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔ ہاں شرکاء کے حصوں کی تعداد مختلف ہو سکتی ہے۔ مثلاً: ایک آدمی کے دو حصے، دوسرے کے تین حصے ہوں اور دو آدمیوں کا ایک ایک حصہ ہو۔ ہاں حصہ برابر ہونا ضروری ہے۔ اگر ایک حصہ میں دو لوگ شریک ہو گئے تو کسی کی قربانی نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک کو ساتویں حصہ سے کم حصہ ملے گا۔

۳۔ اونٹ میں بھی کل سات شرکاء قربانی میں حصہ دار ہو سکتے ہیں جیسا کہ اوپر گائے وغیرہ کی شراکت کے بارے میں واضح کیا گیا ہے کہ ساتوں شراکت داروں کا حصہ برابر ہونا چاہیے۔

ایک اہم مسئلہ: گائے اور اونٹ کی قربانی میں شریک تمام لوگوں کی نیت، عبادت و قربتِ الٰہیہ ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی ایک کی نیت بھی قربت و عبادت کی نہ ہوئی بلکہ محض گوشت زیادہ لینا مقصود ہوا اور یہی اس کی نیت ہوئی تو پھر کسی کی بھی قربانی نہیں ہوگی۔ یہاں یہ امر بھی جاننا ضروری ہے کہ بچے کا عقیقہ اور ولیمہ کی نیت سے گائے، بیل اور اونٹ کی قربانی میں شامل ہو گیا تو چونکہ یہ دونوں

امور بھی نعمتِ اولاد ملنے اور نعمتِ نکاح حاصل ہونے پر اظہارِ تشکر کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی قربت اور اس کی عبادت کا ذریعہ ہیں تو اس صورت میں بھی قربانی کرنا درست اور جائز ہے۔

(ابو بکر علاؤالدین الکاسانی، بدائع الصنائع، ج۵: ۱۷۳)

مسئلہ: ایک گھر کے جتنے افراد صاحبِ نصاب ہیں (ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی مالیت کے برابر نقدی کا ایسا مالک ہونا جو دین سے فارغ ہوا) ان سب پر الگ الگ قربانی کرنا واجب ہے۔ سب گھر والوں کی طرف سے ایک ہی قربانی کافی نہیں۔ قربانی شرائط کے پائے جانے کے ساتھ ہر ایک پر ایسے ہی واجب ہے جیسے نماز اور روزہ ہر ایک پر الگ الگ لازم ہے۔ مرد و عورت دونوں پر واجب ہے۔

گوشت کی تقسیم

سنن نسائی اور دیگر کتب حدیث میں ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قربانی کے گوشت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے:

۱۔ ایک حصہ اپنے اہل خانہ کے لیے

۲۔ ایک حصہ رشتہ داروں اور دوست احباب کے لیے

۳۔ ایک حصہ غرباء، مساکین اور سائل حضرات کے لیے

قربانی کے گوشت کی تین حصوں میں تقسیم ایک مستحب امر ہے۔ اگر قربانی کرنے والا کثیر العیال بھی ہو اور غریب بھی ہو تو ان صورتوں میں وہ سارا گوشت بھی گھر والوں کے لیے رکھ سکتا ہے مگر اس کے باوجود تین حصوں میں تقسیم کرنا ایک افضل عمل ہے۔ اس لیے غریبوں کو عید بقر کی حقیقی خوشی اسی وقت ملے گی جب وہ اور ان کے بچے بقر عید کے موقع پر گوشت کھا کر خوش ہوں گے اور پھر اگر وہ غرباء قربانی کرنے والے کے خونی رشتہ دار بھی ہوں تو ان کو قربانی کا گوشت دینے سے دہرا ثواب ملے گا۔ غریب کو گوشت دینے کا اور صلہ رحمی کرنے کا بھی ثواب ملے گا۔ اس لیے بہتر اور افضل عمل یہی ہے کہ گوشت کو تقسیم کر کے ہر ایک تک اس کا حصہ پہنچایا جائے۔

ڈاکٹر محمد فاروق رانا کو پی ایچ ڈی کی تکمیل پر مبارکباد

گزشتہ ماہ فریدِ ملّتؒ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر محترم ڈاکٹر محمد فاروق رانا نے Ph.D کا اعزاز حاصل کیا۔ آپ نے "مرجع ضمیر کا تعین (معروف اردو تراجم قرآن کا تقابلی جائزہ)" کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ محترم ڈاکٹر علی اکبر الازہری کے زیر نگرانی "دی یونیورسٹی آف لاہور" سے مکمل کیا۔

ڈاکٹر اجمل علی مجددی کو پی ایچ ڈی کی تکمیل پر مبارکباد

گزشتہ ماہ فریدِ ملّتؒ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر محترم ڈاکٹر اجمل علی مجددی نے Ph.D کا اعزاز حاصل کیا۔ آپ نے "معاہداتِ نبویؐ اور امنِ عالم (عصرِ حاضر میں راہنمائی کی صورتیں)" کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ محترم ڈاکٹر ظہور اللہ الازہری کے زیر نگرانی "دی یونیورسٹی آف لاہور" سے مکمل کیا۔

☆ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری، چیئرمین سپریم کونسل M Q I ڈاکٹر حسن محی الدین قادری، صدر منہاج القرآن انٹرنیشنل ڈاکٹر حسین محی الدین قادری، جملہ مرکزی قائدین تحریک، اساتذہ کرام کالج آف شریعہ اور FMRi کی طرف سے محترم ڈاکٹر محمد فاروق رانا اور محترم ڈاکٹر اجمل علی مجددی کو اس اعلیٰ تعلیمی اعزاز پر مبارکباد دی گئی اور دعاؤں سے نوازا گیا۔

ہم محترم ڈاکٹر محمد فاروق رانا اور محترم ڈاکٹر اجمل علی مجددی کو اعلیٰ ترین اعزاز کے ساتھ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے پر خصوصی مبارک باد پیش کرتے ہیں اور ان کی مزید ترقی و کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔

اسلام اور اقامتِ عدل وانصاف

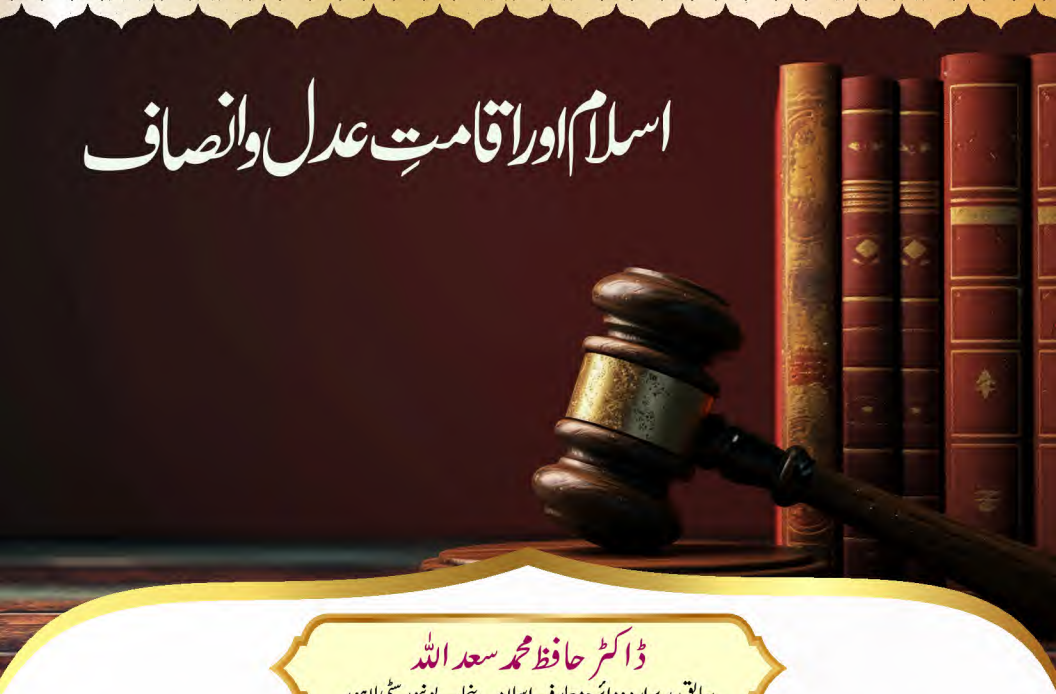

ڈاکٹر حافظ محمد سعد اللہ
سابق مدیر اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

انسانی تاریخ اور مشاہدہ اس بات پر گواہ ہے کہ کوئی معاشرہ اور دستورِ حکومت نظامِ عدل وانصاف کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے شریعتِ اسلامیہ نے انفرادی اور اجتماعی سطح پر اسے سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ حتی کہ اسے حکومت کے اولین فرائض میں شمار کیا ہے۔ اسلامی ریاست کے ہر شہری کو خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی، حاکم ہو یا محکوم، امیر ہو یا غریب، بڑا ہو یا چھوٹا، انصاف مہیا کرنا اور اس کے حقوق کا تحفظ کرنا، اسلامی حکومت کا کوئی احسان نہیں بلکہ اس کا بنیادی اور اساسی فرض ہے۔ عدل و انصاف کے معاملے میں قرآن وسنت نے اپنے ماننے والوں کو کتنی تاکید کی، کتنی باریک بینی سے ہدایات دیں، قاضی کے لیے کتنی احتیاط کرنے کا حکم ہے اور عدالت کے سلسلے میں کتنے سنہری اصول وضوابط مقرر کیے ہیں؟ ان کا مطالعہ آج بھی حدیث و فقہ کی کتابوں میں موجود کتاب القضاء اور کتاب الشہادۃ وغیرہ میں کیا جاسکتا ہے۔

عدل کا معنی صرف مساوات اور برابری نہیں بلکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ کسی شخص کے ساتھ بغیر کسی افراط و تفریط کے وہ معاملہ کرنا جس کا وہ مستحق ہے جبکہ ظلم کے معنی ہیں:

وضع الشئی فی غیر موضعہ۔

(المنجد، تحت مادہ ظلم، دار المشرق، بیروت، ص: ۶۷۴)

کسی چیز کو اس کے اصل مقام کے علاوہ دوسرے مقام پر رکھنا۔ گویا حقدار کی حق تلفی کرنا، اس کا حق دبالینا، کسی دوسرے کو دے دینا یا اس کی ادائیگی میں کمی اور تاخیر کرنا وغیرہ سب ظلم میں داخل ہے۔

اسلام قانون عدل و انصاف کے معاملے میں سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے اور اس معاملہ میں کسی کے حسب و نسب اور جاہ و مرتبہ کو نہیں دیکھتا۔ عام چھوٹے بڑے لوگ تو ایک طرف رہے، سربراہِ مملکت اور خلیفۂ وقت کو بھی کوئی امتیاز اور استثناء حاصل نہیں۔ اس کے خلاف کوئی دعویٰ دائر ہوتا ہے تو اسے بھی عدالت کے کٹہرے میں مدعی کے برابر کھڑا ہونا ہوگا۔ اگر مدعا علیہ غیر مسلم اور قاضی کا دشمن بھی ہے تو محض اس وجہ سے اس کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جاسکتی کہ وہ غیر مسلم یا دشمن ہے۔

فرمانِ الٰہی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (المائدة، ۵: ۸)

”اے ایمان والو! اللہ کے لیے مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے انصاف پر مبنی گواہی دینے والے ہو جاؤ اور کسی قوم کی سخت دشمنی (بھی) تمہیں اس بات پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم (اس سے) عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو (کہ) وہ پرہیزگاری سے نزدیک تر ہے، اور اللہ سے ڈرا کرو! بے شک اللہ تمہارے کاموں سے خوب آگاہ ہے۔“

جس قوم یا جماعت سے مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان کے دشمنی ہوگی، ظاہر ہے وہ دشمنِ اسلام قوم کفار اور غیر مسلموں ہی کی ہوگی۔ تو گویا آیت میں اس امر کی تاکید آگئی کہ دشمنانِ اسلام کے ساتھ بھی ناانصافی اہلِ ایمان کے شایانِ شان نہیں۔ دنیا کا کون سا قانون ایسا ملے گا جس نے اپنے باغیوں اور مخالفوں بلکہ معاندین تک کے حقوق کی یہ رعایت رکھی ہو۔

فقہاء و مفسرین نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے:

دلت الآية على ان كفر الكافر لا يمنع من العدل عليه۔

یہ آیت اس امر پر دلیل ہے کہ کافر کا کفر اس کے ساتھ عدل کرنے سے مانع نہیں۔

(قرطبی، الجامع الاحکام القرآن، ۲: ۷۳)

انسانی نفسیات کے مطابق شدتِ غضب میں اپنے آپ پر قابو رکھنا عموماً مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے تاکید فرما دی گئی کہ جو غصہ تمہارے دلوں میں کفار اور دشمنانِ اسلام کے خلاف ہے وہ کہیں تمھیں ان کے مقابلے میں زیادتی پر آمادہ نہ کر دے۔

تمام اسلامی تعلیمات کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام اور اسلامی ریاست کا سب سے بڑا مقصد ہی دنیا میں عدل و انصاف کا قیام ہے۔ انسانی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیامِ سلطنت، ملک گیری اور ہوسِ زر و اقتدار کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن اسلام

جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ خود مقصود بالذات نہ تھی بلکہ اس کے ذریعہ فرمانِ الٰہی کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا جس میں کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو اور دوست دشمن سب کے ساتھ کسی بھی قسم کے رنگ و نسل، مذہب و مسلک کی تمیز کے بغیر عدل و انصاف ہو۔

عدل و انصاف کا یہی اسلامی تصور کالے گورے، عربی، عجمی، ملکی، غیر ملکی، حاکم محکوم، دوست دشمن سب کو ایک صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ آج عدل و انصاف کے علمبردار عالمی ادارے بھی عدل و انصاف نہ ہونے اور دوہرے معیار کی وجہ سے بے جان ہو کر رہ گئے ہیں۔ دوسری طرف ہم اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ عہد نبوی اور خلفاء راشدین کے ادوار تو اپنی مثال آپ ہیں، اس کے بعد کے زمانوں میں بھی شاید ہی کوئی ایسا واقعہ نہ ملے جس میں کسی غیر مسلم یا دشمن قوم کے فرد کو اسلامی عدالت نے کسی حق سے محض اس لیے محروم کر دیا ہو اور صرف اس وجہ سے اس کے ساتھ ناانصافی کی ہو کہ یہ غیر مسلم ہے۔ اس کی ایک دو نہیں سیکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں کہ مسلمان عدالتوں نے عدل و انصاف کے معاملے میں ہمیشہ حق و ناحق ہی کو مدنظر رکھا ہے۔ یہ محض دعویٰ نہیں بلکہ ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف خود دشمن اقوام کو بھی تھا۔ چنانچہ ایک گواہی ملاحظہ ہو:

فتح خیبر کے بعد حسبِ معاہدہ وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لیے حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔ وہ وہاں گئے اور تخمینہ کر کے ہر کھجور کے درخت سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہی تو اس پر یہودیوں نے کہا کہ یہ تو زیادہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو میں اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہوں، تم لوگ جو حصہ لینا چاہو، لے لو۔ اس انصاف پسندی سے یہود اس قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یک زبان ہو کر پکار اٹھے:

هذا الحق وبه تقوم السماء والارض قد رضينا ان ناخذه بالذی قلت۔

(ابوداؤد، السنن، کتاب البیوع، باب فی المساقات، ۲: ۱۲۹، رقم: ۳۴۰۹)

عدل و انصاف اور حق اسی کا نام ہے اور اسی انصاف سے زمین و آسمان قائم ہیں۔ جو کچھ آپ نے کہا، ہم اس کے قبول کرنے پر راضی ہیں۔

ایک روایت کے مطابق محصل مذکور نے کہا کہ اگرچہ تم میرے نزدیک ساری مخلوق سے زیادہ مبغوض ہو، اس کے باوجود میں تم پر ظلم نہیں کروں گا تو انھوں نے کہا:

لهذا قامت السموات والارض (اسی انصاف سے آسمان اور زمین قائم ہیں) (الموطا، محمد بن حسن، شیبانی، ص: ۳۵۷)

ہر انسان کے ساتھ ہر معاملہ میں بغیر کسی مذہبی و نسلی امتیاز و تخصیص کے نیکی، بھلائی اور عدل وانصاف کرنا اسلام کا طرہ امتیاز ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ (الممتحنۃ، ۶۰: ۸)

"اللہ تمہیں اس بات سے منع نہیں فرماتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین (کے بارے) میں جنگ نہیں کی اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے (یعنی وطن سے) نکالا ہے کہ تم ان سے بھلائی کا سلوک کرو اور اُن سے عدل و انصاف کا برتاؤ کرو، بے شک اللہ عدل و انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔"

اس آیت کریمہ کے سیاق و سباق میں کفار کی دوستی اور موالات سے اہلِ ایمان کو سختی سے منع کیا گیا ہے۔ اس ارشاد کے متعلق یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ یہ ممانعت ان کے کفر کے باعث ہے، اس لیے ان آیات میں اس امر کی وضاحت فرما دی گئی کہ کفار سے عدمِ موالات کا حکم ان کے کفر کے باعث نہیں بلکہ اہلِ اسلام سے ان کی عداوت، بغض اور ظالمانہ روش کے سبب ہے۔ جو کفار اہلِ اسلام کے ساتھ اس قسم کا معاندانہ رویہ نہیں رکھتے، ان کے ساتھ احسان و انصاف کرنے کے معاملے میں کوئی ممانعت نہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آیت میں "بر" (بھلائی) اور "قسط" (انصاف) دو چیزوں کا ذکر آیا ہے تو مناسب تھا کہ یہاں دونوں نیکیوں کے کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔ صرف عدل کرنے والوں ہی کی محبوبیت کا ذکر کیوں آیا۔۔۔؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صلۂ رحمی اور اس قسم کی دیگر نیکیاں نفس پر اتنی بھاری نہیں ہیں جتنی عدل وانصاف ہے۔ بالخصوص جبکہ اس کا تعلق کفار سے ہو۔ کمزوروں کو سہارا دے دینا، محتاجوں کی مدد کر دینا اور اپنے کافر ماں باپ کے ساتھ صلہ رحمی کر دینا زیادہ مشکل کام نہیں ہیں۔ انسانی فطرت کے اندر ان کے لیے نہایت قوی محرکات موجود ہیں لیکن عدل وانصاف کا حق ادا کرنا اور وہ بھی اپنے دشمنوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ (تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، تفسیر سورۃ الممتحنۃ، ۸: ۳۳۴)

علماء اسلام کے نزدیک عدل وانصاف کتنا ضروری ہے اور اسلام میں اس کا کیا مرتبہ و مقام ہے؟ اس کا اندازہ درج ذیل فتویٰ سے لگایا جا سکتا ہے جسے ابن الطقطقی نے ایک اسلامی حکمران کے اندر درکار ضروری خصالِ خیر اور اوصافِ حمیدہ کی وضاحت کے ضمن میں بیان کیا ہے:

جب ہلاکو خان نے بغداد کو ۶۵۷ھ میں فتح کر لیا تو اس نے حکم دیا کہ علماء دین سے یہ فتویٰ پوچھا جائے کہ عدل کرنے والا کافر بادشاہ افضل ہے یا ظلم کرنے والا مسلمان بادشاہ۔۔۔؟ پھر اس نے اس مقصد کے لیے مستنصریہ میں علماء کو جمع کیا۔ جب علماءِ دین کو اس فتویٰ کے بارے میں معلوم ہوا تو جواب دینے سے رک گئے۔ علماء کی اس مجلس میں اس زمانے کے نامور عالم رضی الدین علی بن طاؤس بھی موجود تھے جنھیں ان کے علمی مرتبہ و مقام کی بنیاد پر انتہائی قابلِ تعظیم و احترام سمجھا جاتا تھا۔ جب انھوں نے علماء کی اس ہچکچاہٹ کو دیکھا تو فتویٰ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور ظلم کرنے والے مسلمان بادشاہ پر عدل کرنے والے کافر بادشاہ کی فضیلت کا فتویٰ دیتے ہوئے اس پر اپنے دستخط ثبت فرمائے۔ ان کے بعد دیگر علماءِ دین نے بھی اس فتویٰ پر اپنے اپنے دستخط کر دیئے۔ (الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ، مکتبہ التجاریۃ، الکبریٰ، ص: ۱۱)

دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی فاتح قوم نہیں گزری جو بزورِ شمشیر فتح شدہ کوئی علاقہ محض اس لیے خالی کر دینے پر تیار ہو کہ جنگ کے دوران فاتح قوم سے کوئی عدل و انصاف کے منافی حرکت سرزد ہو گئی ہو۔ اس قسم کی مثالیں اسلامی حکومتوں نے پیش کی ہیں اور اس عروج اور عالمی سیاسی غلبہ کے وقت پیش کی ہیں، جب دنیا کی ہر طاقت ان کے سامنے گھٹنے ٹیک چکی ہے اور دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا حکمران ان کا راستہ روکنے کی جرأت نہیں کر سکتا ہے۔ ذیل میں اس کمال عدل و انصاف کی ایک منفرد مثال ملاحظہ ہو:

اموی دور کے مشہور سپہ سالار اسلام قتیبہ بن مسلم نے وسطی ایشیاء کے علاقہ سمرقند پر حملہ کیا تو اہلِ سمرقند نے جزیہ کی ایک مخصوص مقدار پر ان سے صلح کر لی۔ اس جنگ میں مفتوح قوم میں سے کسی آدمی کی عزت و آبرو پر آنچ آتی ہے نہ کسی کی جائیداد اور مال و دولت کو نقصان پہنچایا جاتا ہے اور نہ اخلاق و کردار سے ہٹ کر کوئی غیر اخلاقی حرکت کسی فوجی سے سرزد ہوتی ہے۔ لیکن اس فاتحانہ داخلے کے موقع پر بعض شرائطِ جنگ کی پاسداری کرنے میں کوتاہی ہو گئی جو محض رسمی نوعیت کی تھیں۔

جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ مسند آرائے خلافت ہوئے تو اہل سمرقند کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرضداشت پیش کی کہ قتیبہ بن مسلم کا ان کے شہر میں داخلہ اور وہاں مسلمانوں کو ٹھہرانا دھوکے کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ یہ چیز معاہدہ میں داخل نہ تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی شکایت سن کر وہاں کے اپنے عامل کو لکھا اور حکم دیا کہ وہ ان کے لیے ایک قاضی مقرر کرے جو ان کی شکایت کا جائزہ لے۔ اگر قاضی وہاں سے مسلمانوں کے نکالنے کا فیصلہ دے تو وہاں سے نکل جاؤ۔ چنانچہ عامل نے اس کیس میں جمیع بن حاضر الباجی کو قاضی مقرر کیا۔ مقدمہ کی سماعت کے بعد قاضی نے حکم دیا کہ مسلمان شہر سے نکل جائیں اور دوبارہ اہل سمرقند سے اعلان

جنگ کریں۔ مگر اہل سمرقند نے دوبارہ جنگ کو پسند نہ کیا اور اپنے درمیان مسلمانوں کے قیام پر رضا مندی ظاہر کر دی۔

(بلاذری، ابوالحسن احمد بن یحیٰ، فتوح البلدان، ص ۴۱۱)

اسلام کے قانون عدل میں یہ بات بھی داخل ہے کہ سربراہِ حکومت، گورنروں، وزراء، اعلیٰ حکام اور عامۃ الناس سب کے لیے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظامِ عدالت ہے۔ کسی کے لیے کوئی قانونی امتیاز نہیں۔ کوئی بڑے سے بڑا قانون کی گرفت سے مستثنیٰ نہیں۔ عدل و انصاف کے معاملے میں اسلامی ریاست کے خلفاء اور قاضیوں نے جو مثالیں قائم کی ہیں۔ ان کی نظیر دنیا کے کسی مذہب، قانون اور آئین میں نہیں پائی جاتی۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیٹھے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک یہودی آیا اور بولا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر دعویٰ کرنے آیا ہے۔ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ابوالحسن! سامنے کھڑے ہو کر جواب دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اٹھے تو ان کے ماتھے پر شکن تھی۔ دعویٰ سنا گیا تو مدعی جھوٹا ثابت ہوا۔ وہ چلا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: جب آپ کو کھڑے ہو کر جواب دینے کو کہا گیا تو آپ چیں بہ جبیں تھے۔ کیا یہودی کے برابر کھڑے ہو کر جواب دینا پسند نہیں کرتے تھے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: یہودی کے برابر کھڑے ہونے میں چیں بہ جبیں ہونے کا سوال نہ تھا مگر جب مجھے ابوالحسن کہہ کر کھڑے ہونے کو کہا گیا تو کنیت سے پکارنا نشانِ عزت ہے، خیال ہوا کہ یہودی یہ نہ سمجھے کہ عدالت کو مدعا علیہ کا خاص لحاظ ہے، اسی لیے مدعی کے مقابلہ میں عزت کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے، اگر وہ ایسا سمجھ لیتا تو ہماری عدالت پر دھبہ لگتا۔

(قاضی سلیمان منصوری پوری، ۳: ۳۶۹)

اسلام میں عدلیہ کو دی جانے والی طاقت اختیارات اور آزادی اسلامی نظام کے محاسن و مفاخر میں سے ایک ہے۔ لہٰذا اسلام کے منصفانہ عادلانہ اور مبنی بر حق نظامِ عدالت میں تمام مظلوموں اور زیادتی کے شکار لوگوں کو خواہ وہ کسی بھی مذہب یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں، اس بات کی ضمانت حاصل تھی کہ ظالم سے انصاف اور غاصب سے ان کا حق دلایا جائے گا۔ اگرچہ ظالم اپنی تمام تر ہیبت و قوت سمیت خود خلیفہ ہی کیوں نہ ہو۔

سانحہ ماڈل ٹاؤن کے 10 برس

متاثرین انصاف سے محروم

نعیم الدین چوہدری ایڈووکیٹ ہائیکورٹ

سانحہ ماڈل ٹاؤن پاکستان کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ جس کی پاکستان کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ مورخہ 17 جون 2024ء کو شہداء سانحہ ماڈل ٹاؤن لاہور کی دسویں برسی ہے لیکن سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین اور شہداء کے لواحقین 10 سال سے انسدادِ دہشت گردی عدالت لاہور سے، لاہور ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ آف پاکستان تک حصولِ انصاف کے لیے مسلسل قانونی چارہ جوئی کر رہے ہیں لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ 10 سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین انصاف سے محروم ہیں۔

مورخہ 17 جون 2014ء کو نواز، شہباز حکومت نے طے شدہ منصوبہ کے تحت ریاستی دہشت گردی کے ذریعے منہاج القرآن اور پاکستان عوامی تحریک کے معصوم، نہتے اور بے گناہ کارکنان کے خون سے ہولی کھیلی۔ اس سانحہ میں 14 افراد شہید ہوئے، ان میں دو خواتین بھی شامل تھیں جس میں سے ایک خاتون حاملہ تھی اور 100 سے زائد افراد گولیوں سے زخمی ہوئے تھے۔ ایسا المناک وقوعہ اس سے پہلے رونما نہیں ہوا جسے کئی گھنٹوں پوری قوم اور دنیا نے TV سکرینز پر براہ راست دیکھا۔

نواز، شہباز حکومت نے پولیس کے ذریعہ پاکستان عوامی تحریک کے لوگوں کا قتل عام کیا اور ظلم وریاستی دہشت گردی کی ایک نئی تاریخ رقم کی گئی۔ حکومت نے اعترافِ گناہ اور مظلوموں کی اشک

شوئی کے اقدامات کرنے کے بجائے پولیس کی مدعیت میں پاکستان عوامی تحریک کے لوگوں پر ہی اسی دن مورخہ 17 جون 2014ء کو مقدمہ نمبر (510/14) تھانہ فیصل ٹاؤن لاہور میں درج کر دیا۔

سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کی وقوعہ کے بعد FIR درج نہ کی گئی تو سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین نے FIR کے اندراج کے لیے جسٹس آف پیس کی عدالت سے رجوع کیا۔ جسٹس آف پیس نے مورخہ 16 اگست 2014ء کو ایف، آئی، آر کے اندراج کا حکم دیا لیکن اس کے باوجود پولیس نے سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کی ایف، آئی، آر کا اندراج نہ کیا۔ ملزمان نے جسٹس آف پیس کے حکم کے خلاف معزز عدالت عالیہ لاہور سے رجوع کیا۔ معزز عدالت عالیہ لاہور نے ملزمان کی پٹیشن (مورخہ 26/08/2014) کو خارج کر دی۔ جس پر بالآخر پولیس نے بہ دل نخواستہ مقدمہ نمبر (696/14) تھانہ فیصل ٹاؤن لاہور مورخہ 28/08/2014 کو درج کر دیا۔ مگر پاکستان عوامی تحریک کے کارکنان پر 50 سے زائد مختلف تھانوں میں ایف، آئی، آر درج کر دی تاکہ سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین، گواہان، مضروبان شامل تفتیش نہ ہو سکیں۔

❖ بعد ازاں اس سانحہ پر حکومت نے ایک JIT تشکیل دی۔ اس JIT نے مقدمہ میں تفتیش، انتہائی متعصبانہ، حقائق کے برعکس اور یکطرفہ کی۔ جو میٹریل، Evidence مقدمہ کی تفتیش کو مکمل کرنے کے لئے Collect کرنی تھی وہ نہ کی گئی۔

❖ تمام ریکارڈ، گورنمنٹ کے اداروں اور ان بااثر ملزمان کے زیر قبضہ تھا جس تک سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کی رسائی ہر گز ممکن نہیں تھی مگر وہ ریکارڈ جس سے مقدمہ نمبر 510/14 جھوٹ کا پلندہ ثابت ہوتا تھا اور مقدمہ نمبر 696/14 سچا ثابت ہوتا تھا، وہ جان بوجھ کر تفتیش کے ریکارڈ کا حصہ نہ بنایا گیا۔

❖ اس JIT نے سرکاری ریکارڈ، میڈیا ریکارڈ، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا ریکارڈ، CDR اور ٹی وی چینلز کے متعلقہ لوگوں کو بھی شامل تفتیش نہ کیا۔

❖ وہ تمام میٹریل اور شہادتیں جن کو تفتیش کا حصہ بنانا ضروری اور لازمی ہے، ان تک تاحال مستغیثِ مقدمہ کی رسائی نہ ہے۔ یہ JIT پوری طرف ناکام رہی کہ ساری شہادتوں کو مسل کا حصہ بنائے۔

❖ درست تفتیش کرنا، درست ٹرائل کرانا ہر شہری کا Statutory Right ہے جو اس کو آئین اور قانون نے دیا ہے۔

❖ یہ JIT کوئی بھی میٹریل شہادتیں صفحہ مسل پر نہ لائی ہے اور اس نے درست حقائق اور صحیح شہادتوں کو چھپایا ہے جو کہ ان کے Part پر بد دیانتی ہے۔

❖ اس JIT نے مذکورہ بالا سارا ریکارڈ جو مقدمہ کے درست فیصلہ کے لیے ضروری تھا، اُسے عدالت میں جمع نہیں کروایا۔

اس JIT نے سانحہ ماڈل ٹاؤن کے کسی زخمی، چشم دید گواہ کا کوئی بیان ریکارڈ نہ کیا بلکہ جانبدار تفتیش کر کے تمام سانحہ کے مرکزی ملزمان سابق وزیر اعظم نواز شریف، موجودہ وزیر اعظم میاں شہباز شریف، سابق وزیر قانون پنجاب رانا ثناءاللہ و دیگران اور پولیس افسران جو بطور ملزمان ایف آئی آر میں نامزد تھے، بدیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس JIT نے ان ملزمان کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی بلکہ ان تمام ملزمان کو کلین چٹ دے دی گئی اور سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کی دادرسی نہ کی گئی۔

❖ اس صورت حال میں سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کے پاس استغاثہ دائر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ لہذا عدالت میں چالان پیش ہونے کے فوری بعد انسداد دہشت گردی عدالت لاہور میں استغاثہ دائر کر دیا گیا۔ استغاثہ کیس میں 56 زخمی و چشم دید گواہان کے بیانات مکمل ہونے کے بعد مورخہ 7 فروری 2017ء کو انسداد دہشت گردی عدالت لاہور نے سانحہ ماڈل ٹاؤن کیس میں 124 ملزمان، کانسٹیبل سے لے کر آئی جی پنجاب تک، اس وقت کے DCO کیپٹن (ر) محمد عثمان، اس وقت کے TMO نشتر ٹاؤن علی عباس بخاری، اس وقت کے AC ماڈل ٹاؤن طارق منظور چانڈیو کو بطور ملزمان طلب کر لیا تھا لیکن 12 ملزمان جن میں میاں نواز شریف، میاں شہباز شریف، رانا ثناءاللہ، ڈاکٹر توقیر شاہ و دیگران جنہوں نے اس سانحہ کی منصوبہ بندی کی تھی، ان کو طلب نہ کیا تھا۔

❖ استغاثہ میں ٹرائل کورٹ از خود فوجداری مقدمہ کی سماعت کے دوران شفاف ٹرائل کے لیے بقیہ شہادت برآمدگی، فرانزنک اور ڈیجیٹل وغیرہ کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی ہے۔ بلکہ صرف اور صرف غیر جانبدار JIT ہی شفاف ٹرائل کے لئے ان تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے۔ اس لئے 2018ء میں تنزیلہ امجد (مقتولہ سانحہ ماڈل ٹاؤن) کی بیٹی بسمہ امجد نے سانحہ ماڈل ٹاؤن کی غیر جانبدار تفتیش کے لیے سپریم کورٹ ہیومن رائٹس کیس نمبر 69031/18 میں نئی JIT کے لئے درخواست گزاری جس کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی سربراہی میں 5 رکنی لارجر بینچ نے مورخہ 5 دسمبر 2018ء کو سپریم کورٹ اسلام آباد میں سماعت کی اور شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے دلائل کی روشنی میں سانحہ ماڈل ٹاؤن کیس کی از سر نو تفتیش کے لئے نئی JIT بنانے کا فیصلہ ہوا۔

❖ مورخہ 3 جنوری 2019ء کو پنجاب حکومت نے اے ڈی خواجہ کی سربراہی میں نئی JIT کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا۔ سپریم کورٹ کے فلور پر سانحہ ماڈل ٹاؤن کی تفتیش کے لئے تشکیل پانے والی نئی

JIT نے مورخہ 14 جنوری 2019ء سے لے کر 20 مارچ 2019ء تک سانحہ ماڈل ٹاؤن کے تمام زخمی، چشم دید گواہان اور شہداء کے لواحقین کے بیانات ریکارڈ کر لئے تھے اور سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کی طرف سے نئی JIT کے روبرو پہلی دفعہ تمام زبانی و دستاویزی ثبوت شہادتوں کی شکل میں پیش کر دیے گئے اور اس طرح اس نئی JIT نے سانحہ ماڈل ٹاؤن کے تمام ملزمان سے بھی تفتیش مکمل کر لی تھی۔

❖ سربراہ JIT اے ڈی خواجہ نے لاہور ہائی کورٹ میں جواب داخل کروایا۔ اُس ریکارڈ کے مطابق نئی JIT نے 281 بیانات ریکارڈ کیے اور 80% تفتیش مکمل کر لی۔ نئی JIT نے سانحہ ماڈل ٹاؤن کے تمام ملزمان بشمول سابق وزیر اعظم میاں نواز شریف، موجودہ وزیر اعظم میاں شہباز شریف، سابق وزیر قانون پنجاب رانا ثناء اللہ، ڈاکٹر توقیر شاہ PSO ٹو وزیر اعلیٰ پنجاب، سابق آئی جی پنجاب مشتاق احمد سکھیرا سے مختلف پہلوؤں پر تفتیش مکمل کر لی تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ وقوعہ کیوں ہوا ہے؟ اس کے پیچھے کیا سازش کارفرما تھی؟ اس وقوعہ کے پیچھے کون کون سازشی عناصر موجود ہیں؟ اور یہ سازش کہاں سے چلی؟ اور کس طرح اس سازش پر عملدرآمد ہوا؟

❖ اس نئی JIT کے ذریعے حقائق سامنے آنے کے خوف کے سبب فوری طور پر کچھ قوتیں متحرک ہو گئیں اور سانحہ ماڈل ٹاؤن کے ملزمان (رضوان قادر ہاشمی SHO تھانہ فیصل ٹاؤن، مدعی مقدمہ 510/14) اور خرم رفیق ہیڈ کانسٹیبل کی درخواست پر لاہور ہائی کورٹ نے JIT کی تشکیل کا پنجاب حکومت کا نوٹیفکیشن 22 مارچ 2019ء کو معطل کر دیا اور JIT کو سانحہ ماڈل ٹاؤن کی مزید تفتیش کرنے سے روک دیا گیا۔

❖ JIT کے نوٹیفکیشن کی معطلی کے خلاف لاہور ہائی کورٹ کے عبوری حکم مورخہ 22 مارچ 2019ء کے خلاف سپریم کورٹ اسلام آباد میں رجوع کیا۔ مورخہ 13 فروری 2020ء کو سابق چیف جسٹس، جسٹس گلزار احمد کی سربراہی میں 3 رکنی بینچ نے سماعت کی، جس میں سپریم کورٹ نے 13 فروری 2020ء کو لاہور ہائی کورٹ کو ڈائریکشن دی کہ نیا بینچ تشکیل دے اور ترجیحاً تین ماہ کے اندر فیصلہ کیا جائے۔ لیکن سپریم کورٹ کی تین ماہ کی ڈائریکشن کے باوجود بھی لاہور ہائی کورٹ کے 7 رکنی لارجر بینچ نے فریقین کے دلائل جو عرصہ دراز سے مکمل ہو چکے ہیں، اس کے باوجود تاحال فیصلہ نہیں کیا۔

یہ JIT جسے ہائی کورٹ نے معطل کر رکھا ہے، سارا میٹریل Collect کر کے 173 Crpc کی رپورٹ عدالت میں بھجوائے تو تب ہی استغاثہ کی کاروائی میں وہ میٹریل طلب کیا جا سکتا ہے اور اس بنیاد پر ہی سزا و جزا کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس JIT کی معطلی کا حکم ختم کر کے اس کا اپنے کام کو مکمل کرنا لازم و ضروری ہے تاکہ تمام ریکارڈ کو طلب کر کے صفحہ مسل پر لایا جا سکے۔

❖ انسداد دہشت گردی عدالت لاہور نے سانحہ ماڈل ٹاؤن استغاثہ کیس میں مرکزی ملزمان کو طلب نہ کیا تو اس حکم کے خلاف مستغیث نے معزز عدالت عالیہ لاہور سے رجوع کیا جو بآور ثابت نہ ہوا اور مستغیث استغاثہ نے لاہور ہائی کورٹ کے حکم کے خلاف عدالت عظمیٰ پاکستان میں Crl.P.L.A No 1039/18 دائر کر دی، جو تا حال سماعت کے لیے مقرر نہ ہوئی ہے۔

❖ جسٹس باقر نجفی کمیشن رپورٹ سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کو مل گئی تھی۔ جس میں سانحہ ماڈل ٹاؤن میں قتل و غارت گری کرنے کا ذمہ دار 2014ء کی پنجاب حکومت اور پنجاب پولیس کو ٹھہرایا ہوا ہے۔ لیکن جسٹس باقر نجفی کمیشن رپورٹ کے ساتھ منسلکہ دستاویزات جس میں ملزمان کے بیان حلفی ٹیلی فون ڈیٹا ریکارڈ، حساس اداروں کی رپورٹس و دیگر دستاویزات شامل ہیں، وہ تمام دستاویزات سانحہ کے متاثرین کو آج تک فراہم نہ کی گئی۔ ان تمام منسلکہ دستاویزات کے حصول کے لیے

2018ء میں لاہور ہائی کورٹ میں رٹ دائر کی ہوئی ہے جو کہ ابھی تک لاہور ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے جس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔

❖ انسداد دہشت گردی عدالت لاہور نے ہمارے 5 مرکزی ملزمان (سابق ڈی سی او لاہور کیپٹن (ر) محمد عثمان، سابق آئی جی پنجاب مشتاق احمد سکھیرا، سابق ڈی آئی جی آپریشنز رانا عبدالجبار، سابق ایس پی ماڈل ٹاؤن لاہور طارق عزیز، سابق ٹی ایم او نشتر ٹاؤن لاہور علی عباس بخاری) کو استغاثہ کیس میں 265/k ضابطہ فوجداری کے تحت بری کر دیا ہے اور سانحہ کے مزید 8 ملزمان نے بھی انسداد دہشت گردی عدالت لاہور میں بریت کے لیے 265/k ضابطہ فوجداری کے تحت درخواستیں دے رکھی ہیں۔

اِن پولیس افسران کی بریت سے یہ امر متحقق ہو گیا ہے کہ انصاف کا نظام ظلم کا نظام بن چکا ہے۔ ایک منصوبہ بندی کے تحت ملزموں نے ٹرائل کورٹ میں بریت کی درخواستیں دی ہیں۔ اگر ملزمان ٹرائل کورٹ سے بریت کے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر اگر جے آئی ٹی کو کام کرنے کی اجازت مل بھی گئی تو انصاف نہیں ہو سکے گا کیونکہ قانون کے مطابق ایک کیس میں کسی پر دو بار مقدمہ نہیں چل سکتا۔ لگتا ہے یہ محض اتفاق نہیں ہے بلکہ ایک پلاننگ کے ساتھ شہداء کے ورثاء کے ساتھ قانونی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

❖ سپریم کورٹ کے حکم سے پنجاب حکومت کی طرف سے 14 جنوری 2019ء میں اے ڈی خواجہ کی سربراہی میں تشکیل دی جانے والی نئی JIT جسے لاہور ہائی کورٹ نے 22 مارچ 2019ء کو معطل کر دیا تھا، اس JIT کی بحالی سے ہی سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کو انصاف ملے گا۔

اس JIT کو معطل کرنے کی دلیل یہ پیش کی گئی تھی کہ چونکہ پہلے سے ہی اس سانحہ پر ایک JIT موجود ہے جو اپنی تفتیش کر چکی ہے (حالانکہ اُس پہلی JIT) نے مکمل طور پر متعصبانہ طرزِ عمل اختیار کیا اور متاثرین کے بجائے ملزمان کی پشت پناہی کی اور ہم اس پر پہلے ہی دن سے عدم اعتماد کا اظہار کر چکے تھے) جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سیکشن 19 انسداد دہشت گردی ایکٹ 1997ء کے تحت ایک سے زائد JIT بنانے میں کوئی قانونی رکاوٹ نہ ہے۔ جب تک کسی مقدمہ کا فیصلہ نہ ہو جائے، اس وقت تک دوبارہ تفتیش ہو سکتی ہے، اگر عدالت میں مقدمہ کا چالان اور فردِ جرم بھی عائد ہو جائے تو بھی دوبارہ تفتیش سے روکا نہیں جا سکتا ہے۔

غیر جانبدار تفتیش سے ہی انصاف کا عمل ٹریک پر آئے گا۔ کسی بھی مقدمہ کے انصاف کے لیے شفاف تفتیش کا ہونا ضروری ہے۔ شفاف ٹرائل اس وقت تک ناممکن ہے جب تک شفاف تفتیش نہ ہو

لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ شفاف ٹرائل تو دور کی بات ابھی تک سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کو غیر جانبدار تفتیش کا حق جو عدالت عظمیٰ نے دیا تھا اور JIT کی تفتیش جو آخری مراحل میں تھیں، معزز عدالت عالیہ لاہور نے اس کو روک کر تاحال اس پر آج تک کوئی فیصلہ نہ دیا ہے۔ معزز عدالت عالیہ لاہور اور معزز عدالت عظمیٰ پاکستان میں زیر سماعت درخواست ہائے کے فیصلہ کے بغیر ٹرائل کو جاری رکھنا انصاف کا قتلِ عام ہے۔

JIT کی بحالی سانحہ ماڈل ٹاؤن کے انصاف کے لئے اشد ضروری ہے۔ کیونکہ اصل ملزمان نواز شریف، شہباز شریف، رانا ثناءاللہ، ڈاکٹر توقیر شاہ اور دیگر ملزمان جنہوں نے اس سانحہ کی منصوبہ بندی کی تھی ان کو استغاثہ کیس میں ناکافی شہادت کی بنیاد پر انسداد دہشت گردی عدالت اور لاہور ہائی کورٹ نے بحیثیت ملزم طلب نہیں کیا تھا۔ کیونکہ استغاثہ کی دائر گی کے وقت جو شہادتیں اس وقت دستیاب تھیں، وہ استغاثہ کیس میں دے دی گئیں تھیں لیکن کچھ ایسی شہادتیں جن میں ان کا براہ راست ملوث ہونا پایا جاتا ہے، وہ تمام کی تمام شہادتیں نواز، شہباز حکومت جانے کے بعد اور جسٹس باقر نجفی کمیشن رپورٹ آنے کے بعد میسر آئی تھیں۔ وہ تمام کی تمام شہادتیں نئی JIT کو فراہم کر دی تھیں۔ اس سے پہلے جتنی بھی انوسٹی گیشن ہوئی تھی، وہ حقائق کے برعکس، جانبدار اور یکطرفہ ہوئی تھیں۔ پہلی والی JIT نے جتنی بھی انوسٹی گیشن کی تھی، وہ صرف اور صرف ملزمان کو بچانے اور اصل حقائق کو چھپانے کے لئے کی تھیں تاکہ اصل حقائق منظر عام پر نہ آسکیں۔

سانحہ ماڈل ٹاؤن کے حصولِ انصاف کی جدوجہد کو 10 سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی قائد تحریک منہاج القرآن شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی ذاتی دلچسپی اور راہنمائی میں انسداد دہشت گردی عدالت سے لے کر سپریم کورٹ تک مسلسل قانونی چارہ جوئی پوری طاقت، عزم، استقامت کے ساتھ جاری وساری ہے۔ اور ان شاءاللہ تعالیٰ اُس وقت تک جاری رہے گی جب تک سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین اور شہداء کے لواحقین کو انصاف نہیں مل جاتا اور اس سانحہ میں ملوث عناصر کیفرِ کردار تک نہیں پہنچ جاتے۔

عرس مبارک: حضرت ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ

رپورٹ: سعید اختر منہاجین

۱۶ شوال المکرم بمطابق 25 اپریل بروز جمعرات مرکزی سیکرٹریٹ تحریک منہاج القرآن سے محترم نائب ناظم اعلیٰ ایڈمنسٹریشن محمد جواد حامد کی قیادت میں 20 رکنی کاروانِ فریدِ ملت حضرت فرید ملت ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ کے عرس کی تقریبات میں شرکت کے لیے جھنگ روانہ ہوا۔ فیصل آباد میں امین پور انٹر چینج کے قریب آستانہ عالیہ نوروالے کے سجادہ نشین محترم سید اظہر حسین گیلانی اور تنظیمی ساتھیوں محترم ملک سرفراز قادری، محترم غلام مصطفی اور محترم محمد شکیل نے قافلے کا پرتپاک انداز میں استقبال کیا۔ اس موقع پر محترم سید اظہر حسین گیلانی نے شرکاء کاروانِ فریدِ ملت سے شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی خدمات کے حوالے سے گفتگو فرمائی۔ آستانہ عالیہ فریدیہ اور دارالعلوم فریدیہ جھنگ پہنچنے پر قافلے کا استقبال محترم حافظ عبدالقدیر منہاجین نے کیا۔ آپ طویل عرصے سے آستانہ عالیہ فریدیہ اور دارالعلوم فریدیہ قادریہ پر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

نماز عصر کی ادائیگی کے بعد مزار مبارک پر چادر پوشی کی رسم ادا کی گئی۔ نماز عشاء کی ادائیگی کے فوری بعد عرس مبارک کے دوسرے سیشن کا آغاز تلاوت کلام مجید سے ہوا۔ زینت القرا محترم قاری نور احمد چشتی نے تلاوت کی۔ ملک کے نامور نعت خواں حضرات محترم اختر قریشی، محترم شہباز قمر فریدی، محترم شہزاد برادران، محترم شکیل احمد طاہر اور دیگر مقامی نعت خواں حضرات نے حضور نبی اکرم ﷺ

کی بارگاہ میں گلہائے عقیدت پیش کیے۔ نقابت کے فرائض محترم علامہ غلام ربانی تیمور نے سرانجام دیئے۔ عرس کی تقریبات کی صدارت محترم ناظم اعلیٰ خرم نواز گنڈاپور تحریک منہاج القرآن نے کی۔ محترم صبغت اللہ قادری متولی دربار فریدیہ خرابی صحت کی بنا پر عرس کی تقریبات میں شرکت نہ کرسکے ان کی جگہ ان کے بڑے بیٹے محترم محمد طاہر قادری اور چھوٹے بیٹوں نے شرکت کی۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے اپنے خطاب میں حضرت ڈاکٹر فریدالدین قادریؒ کی حیات مبارکہ کے مختلف گوشوں پر گفتگو فرمائی اور عرس کی تقریبات کے انتظام وانصرام پر محترم ناظم اعلیٰ محترم جواد حامد اور ان کی ٹیم اور دیگر قائدین کو مبارک باد دی۔ محترم علامہ محمد ادریس رانا نے حضرت ڈاکٹر فریدالدین قادری اور شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے حوالے سے گفتگو کی۔ تقریب کے اختتام پر ملک و قوم کے لیے خصوصی دعا کی گئی۔

عرس مبارک کی تقریب میں محترم محمد جواد حامد، محترم راجہ زاہد محمود، محترم سید الطاف حسین گیلانی، محترم صاحبزادہ محمد سلیمان قمر قادری، محترم نوراللہ صدیقی، محترم عبدالرحمن، محترم عبدالحفیظ چودھری، محترم قاری ریاست علی چدھڑ، محترم غلام ربانی تیمور، محترم اختر قریشی، محترم شہزاد رسول قادری، محترم حاجی اسحاق، محترم عین الحق بغدادی، محترم ڈاکٹر عتیق الرحمن، محترم حفیظ چودھری، محترم عابد بشیر قادری، محترم نشاط باجوہ ایڈووکیٹ، محترم الیاس ملنگی، محترم باباغلام فرید گوشہ درود، محترم محمد عمر، محترم راشد منہاس اور کثیر تعداد میں قائدین اور مقامی لوگوں نے خصوصی شرکت کی۔

18 مئی 2024ء بروز ہفتہ ناظمِ دعوت نظامتِ امور خارجہ
محترم علامہ غلام ربانی تیمور ایک حادثہ میں انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

مرحوم جامعہ اسلامیہ منہاج القرآن سے 1994ء سے سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد سے تادم وصال منہاج القرآن سیکرٹریٹ میں مختلف ذمہ داریوں پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے مرحوم کی ناگہانی وفات پر دلی دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اپنے تعزیتی بیان میں کہا کہ علامہ غلام ربانی تیمور کے انتقال کی خبر سن کر مجھے گہرا دلی صدمہ پہنچا ہے۔ علامہ غلام ربانی تیمور تحریک منہاج القرآن کے عظیم راہنما، سپوت اور محبت، وفا اور استقامت کا پیکر تھے۔ مصطفوی مشن کے فروغ کیلئے ان کی خدمات قابل تحسین ہیں۔ علامہ غلام ربانی تیمور کے انتقال کی خبر سے تحریک منہاج القرآن کے اندرون وبیرون ملک مقیم ہزارہا کارکنان کو صدمہ پہنچا ہے۔ علامہ غلام ربانی تیمور علم دوست اور انتہائی ملنسار شخصیت کے مالک تھے، تحریک منہاج القرآن کا عظیم اثاثہ تھے، ان کے شب و روز دین مصطفی ﷺ کی حقیقی تعلیمات کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف تھے۔ ان کی ناگہانی وفات سے تحریک منہاج القرآن کے کارکنان اور علمی حلقے ایک مخلص، وفادار اور دین دوست شخصیت سے محروم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے، ان کی قبر کو جنت کے باغات میں سے ایک باغ بنائے اور ورثاء کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق دے۔

چیئرمین سپریم کونسل ڈاکٹر حسن محی الدین قادری، صدر منہاج القرآن پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری، نائب صدر بریگیڈیئر (ر) اقبال احمد خان، ناظم اعلیٰ خرم نواز گنڈاپور اور جملہ مرکزی عہدیداران نے علامہ غلام ربانی تیمور کے انتقال پر دلی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ علامہ غلام ربانی تیمور تحریک منہاج القرآن کے عظیم رہنما تھے، مصطفوی مشن کیلئے ان کی مثالی خدمات ہر کارکن کیلئے رول ماڈل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ علامہ غلام ربانی تیمور رحمۃ اللہ علیہ کی ناگہانی وفات تحریک منہاج القرآن کے ذمہ داران اور کارکنان کے لیے ایک عظیم صدمہ ہے۔ اللہ رب العزت دینِ متین کے لیے ان کی مساعیٔ جمیلہ کو شرفِ قبولیت عطاء فرمائے۔ اللہ رب العزت انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور سوگوار خاندان کو یہ عظیم صدمہ برداشت کرنے کی ہمت و توفیق دے۔

منہاج القرآن انٹرنیشنل کے صدر پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری نے علامہ غلام ربانی تیمور کی نمازِ جنازہ مرکزی سیکرٹریٹ ماڈل ٹاؤن لاہور میں پڑھائی، جس میں ہزاروں افراد نے خصوصی شرکت کی اور مرحوم کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کی معرکہ آراء تصانیف

پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری کی معرکہ آراء تصانیف

شیخ حماد مصطفیٰ المدنی القادری کی تصنیف

Monthly
MINHAJ-UL-QURAN LAHORE
JUNE-2024
Regd CPL No.41

علمی و عملی، اخلاقی و روحانی، تعلیمی و سائنسی،
فقہی و قانونی، انقلابی اور فکری و عصری
موضوعات پر شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی
625 سے زائد کتب دستیاب ہیں